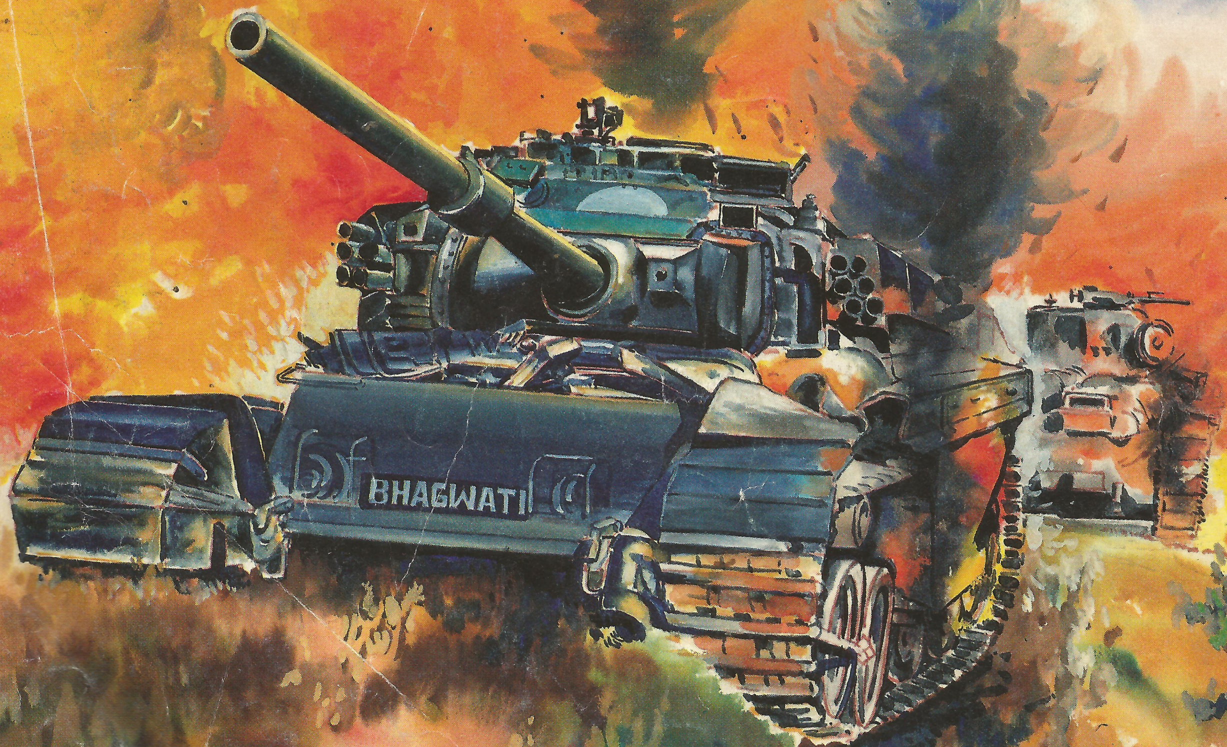
تعلیم و تربیت

ستمبر

1988



اڑتالیسواں سال - چھٹا شمارہ

ماہنامہ

تعلیم و تربیت

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر : عبدُالسلام

ایڈیٹر : ظہیر سلام

سینیئر اسسٹنٹ ایڈیٹرز : سعید لخت مقبول انور داؤدی
ڈاکٹر عبدالرؤف

اسسٹنٹ ایڈیٹر : سیماں علی

آرٹ ڈائریکٹر : محمود حسن رُومی

سرکولیشن منیجر : الطاف احمد

ایڈورٹائزنگ منیجر : مبشر علی خان

ڈسٹری بیوشن منیجر : شہزاد اصغر

اکاؤنٹس منیجر : محمد انور بھٹی

جنرل منیجر پروڈکشن : ایم جاوید خان

منیجر پلاننگ : فاروق عالم

سرکولیشن اسسٹنٹ : محمد بشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
پبلشر : ظہیر سلام
پرنٹر : عبدُالسلام

شعبہ ادارت و اشتہارات
۳۲۔ شارع بن بادیس (ایمپرس روڈ) لاہور
فون :- 63090-226819

سرکولیشن اور اکاؤنٹس
۶۰۔ شاہراہ قائد اعظمؒ لاہور
فون :- 301196-97

راولپنڈی آفس
۲۷۷۔ پشاور روڈ
فون :- 63503-64273

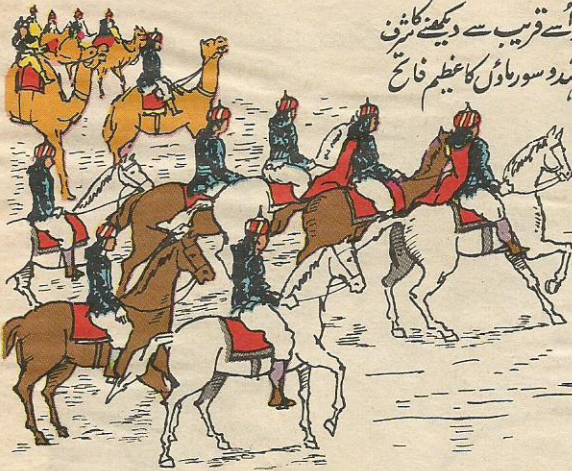
کراچی آفس
مہران ہائٹس - مین کلفٹن روڈ
فون :- 537730

ستمبر 1988

قیمت فی پرچہ =/8 روپے

سرورق کہانی : 6 ستمبر

محمدؐ بن قاسم



تلوار کا دھنی تو وہ تھا ہی مگر جن لوگوں کو اُسے قریب سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا اُنھیں جلد ہی معلوم ہوگیا کہ ہندو سورماؤں کا عظیم فاتح سیرت اور اخلاق کے اعتبار سے بھی دلوں کا عظیم فاتح ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کو اسلام اور مسلمانوں کی عظمت سمجھ میں آتی گئی اور وہ دھڑا دھڑ مسلمان ہوتے گئے۔

پانچویں قسط۔ صفحہ 52

بِسمِ اللّٰہِ الرّحمٰنِ الرّحیمؕ

السّلامُ علیکُم

جب **تعلیم و تربیت** چھوٹے سائز کا تھا تو اُس کے آخر میں آٹھ دس صفحے ننھّے ادیبوں کے لیے مخصوص ہوتے تھے، جن میں بچّوں کے لکھے ہوئے مضمون اور کہانیاں چھپتی تھیں۔ اس سال مئی سے **تعلیم و تربیت** نے نیا رُوپ بدلا تو یہ سِلسلہ ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ تصویری کہانیوں کا سِلسلہ شرُوع کیا گیا۔

لیکن ہمارے بہُت سے ساتھی ایسے ہیں جو اپنے کسی پسندیدہ موضُوع پر لکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ہم پر زور دے رہے ہیں کہ "ننھّے ادیب" دوبارہ شرُوع کیا جائے۔ اب آپ بتایئے، آپ کی کیا رائے ہے؟ اگر اکثریّت کا فیصلہ اِس تجویز کے حق میں ہُوا تو اگلے ماہ سے ننھّے ادیبوں کے لیے تین چار صفحے مخصوص کر دیے جائیں گے۔ تصویری کہانی کا انعامی سِلسلہ بدستُور جاری رہے گا۔

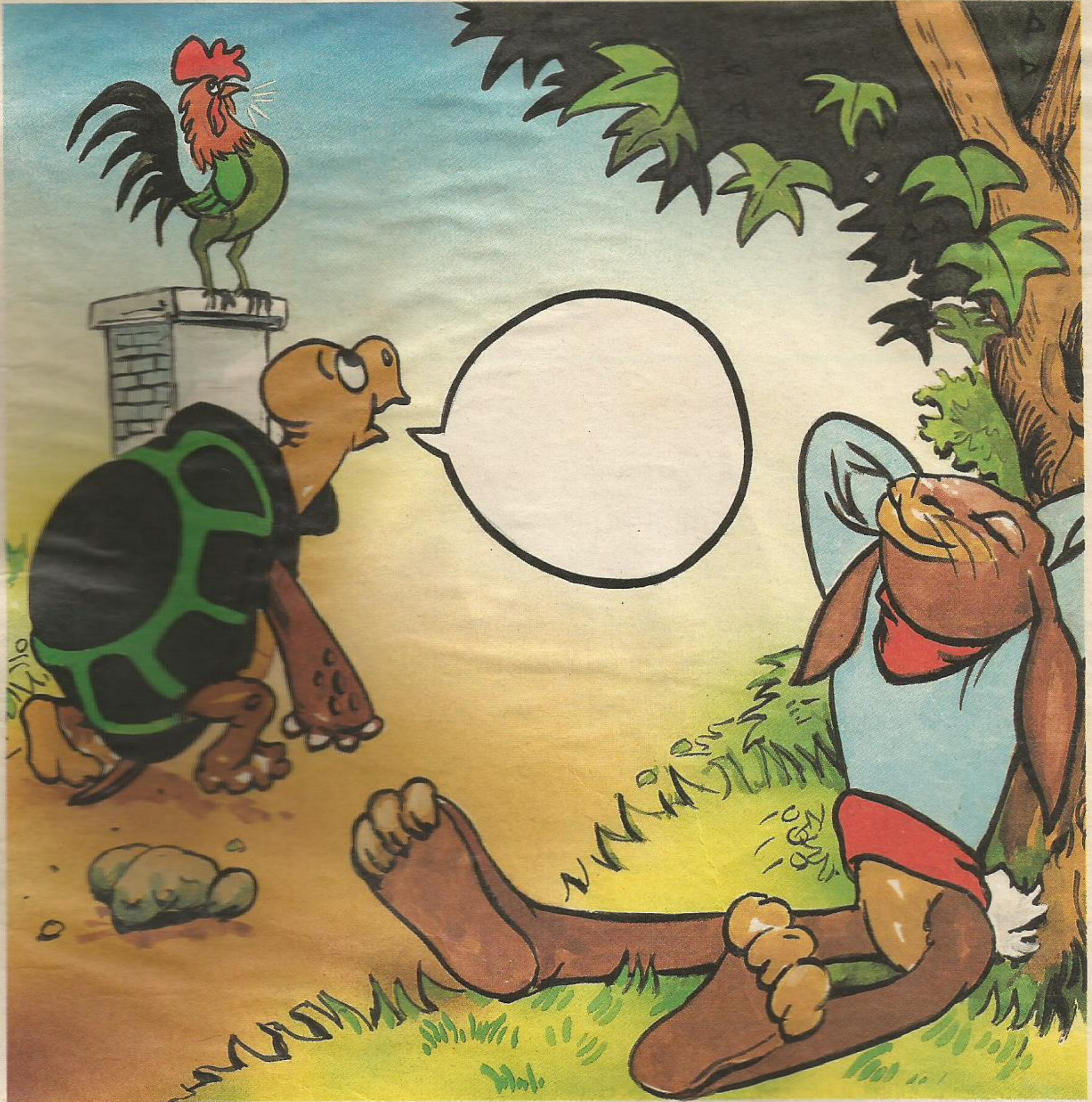
تعلیم و تربیت کے ہر پرچے میں سالانہ خریداری کا ایک کارڈ لگا ہوتا ہے۔ اُس میں صاف طور پر لکھا ہے کہ رسالے کی سالانہ قیمت بذریعہ چیک یا بینک ڈرافٹ بھیجیے۔ لیکن بعض بچّے ڈاک کے عام لفافے میں رقم رکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ اِس طرح بھیجی ہوئی رقم کا نہ ڈاک خانہ ذمّے دار ہوتا ہے اور نہ وہ شخص جسے رقم بھیجی گئی ہے۔ اگر آپ سالانہ خریدار بننا چاہتے ہیں تو خریداری کارڈ اپنے کسی بزرگ سے پُر کرائیں اور اُن کے مشورے پر عمل کریں۔

ایڈیٹر

فہرست مضامین

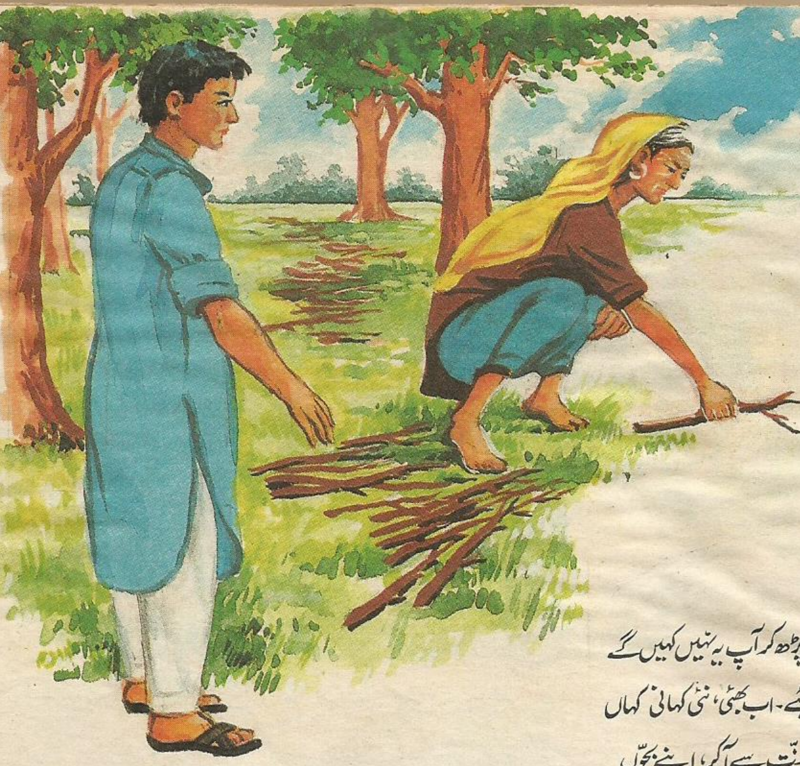
بلاعُنوان

اِس کارٹُون کا عُنوان لکھیے اور 250 روپے کے انعامات حاصل کیجیے۔ تین بہترین عنوانات پر 50 رُپے، 30 رُپے اور 20 روپے کی کتابیں دی جائیں گی۔ دس خصُوصی انعامات پندرہ پندرہ روپے کی کتابوں کے دیے جائیں گے۔ آخری تاریخ 10 ستمبر ہے۔



نتیجہ بِلاعُنوان اگست 1988 : 12,500 عُنوانات موصُول ہُوئے۔ جن میں سے سات بچّوں کے عُنوان ججوں نے پسند کیے۔ اِنھیں انعام مُبارک ہو۔

پہلا انعام (60 رُوپے کی کتابیں) : ثروت۔ گورنمنٹ سنٹرل ایمپلائیز کالونی وحدت روڈ۔ لاہور (کرلو جو کرنا ہے۔ میں تو یہی ٹی شرٹ پہنوں گا)۔ دُوسرا انعام (50 رُوپے کی کتابیں) : افشاں رفیع۔ 1 - Z - 23 مدینہ ٹاوٗن فیصل آباد (خُوب گزرے گی جو مِل بیٹھیں گے دیوانے دو)۔ تیسرا انعام (40 رُوپے کی کتابیں) : جہاں زیب قمر مکان نمبر $\frac{132}{B}$ سیٹلائٹ ٹاوٗن۔ بی بلاک۔ سرگودھا۔ مندرجہ ذیل بچّوں کو 25، 25 رُوپے کی کتابیں دی گئی ہیں : (1) محمد زین العابدین۔ معرفت ظفر علی ہاشمی ایڈوکیٹ ڈسٹرکٹ کورٹس۔ بہاول پُور (ہم تُم سے کم نہیں)۔ (2) نینا جمیل۔ مکان 474 - بلاک R فرید ٹاوٗن۔ ساہیوال (ہم بھی کسی سے کم نہیں) (3) محمد اشرف کوثر 27 دارالسلام گوجرانوالہ (جِس کا لباس اُسی کو ساجھے) (4) وجیہہ شکیب۔ المجُاہد۔ 110 گُل بہار کالونی نمبر 2 - سٹریٹ 17- پشاور شہر (چیتا بنا بِلّی)۔



مولا بخش

ایک دفعہ کا ذکر ہے . . . . .

لیکن ذرا ٹھہریے۔ پہلے یہ وعدہ کیجیے کہ کہانی پڑھ کر آپ یہ نہیں کہیں گے کہ جی، یہ تو ہماری سُنی ہُوئی ہے۔ کوئی نئی کہانی سُنائیے۔ اب بھئی، نئی کہانی کہاں سے لائیں؟ نئی کہانی تو وہی تھی جو بابا آدمؑ نے، جنّت سے آکر، اپنے بچّوں کو سُنائی تھی۔ جب سے اب تک انسان اُسی کہانی کو دُہرا رہا ہے۔ ہاں البتّہ کہنے کا ڈھنگ ہر شخص کا الگ الگ ہوتا ہے۔

تو سُنیے ایک پُرانی کہانی، نئے ڈھنگ اور نئے انداز سے :

لاہور کے قریب کسی گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا۔ اُس کے دو بچّے تھے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکی کا نام زیبو تھا اور لڑکے کا للّو۔ لڑکی بڑی تھی اور وہیں گاؤں میں چودھری کرم دین کے لڑکے کے ساتھ اُس کی منگنی ہو گئی تھی۔ مگر چودھری بہُت لالچی تھا۔ اُس نے کسان سے کہا تھا کہ جب تک تُم اپنی بیٹی کو پچاس ہزار رُوپے کا جہیز نہ دو گے، میں برات نہیں لاؤں گا۔

بے چارے کِسان کے لیے اپنے بیوی بچّوں کا پیٹ پالنا ہی مُشکل تھا، وُہ پچاس ہزار رُوپیہ کہاں سے لاتا۔ دِن رات کی یہ فِکر اُسے گھُن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔

للّو سے اپنے باپ کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ اُس نے کہا "بابا! میں شہر جا کر محنت مزدُوری کرتا ہُوں۔ کُچھ رُوپیہ تُم جمع کرنا، کُچھ میں۔ اِس طرح دو ایک سال میں ہمارے پاس پچاس ہزار رُوپیہ جمع ہو جائے گا۔"

کِسان کا دل تو نہ چاہتا تھا کہ اکلوتے بیٹے کو اپنے سے جُدا کرے، مگر کیا کرتا، مجبُوری تھی۔ سینے پر صبر کا پتّھر رکھا اور اُسے نیک دُعاؤں کے ساتھ رُخصت کیا۔

للّو گاؤں سے نِکل کر ناک کی سیدھ چلتا گیا، چلتا گیا۔ کُچھ دُور چل کر، ایک جنگل میں، اُسے ایک بُڑھیا مِلی۔ نہ مُنھ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت۔ نِرا ہڈّیوں کا ڈھانچا۔ وہ لکڑیاں چُن رہی تھی۔ للّو کو اُس پر ترس آ گیا۔ اُس نے جھٹ پٹ بہُت سی لکڑیاں جمع کر کے گٹھّا باندھا اور بُڑھیا سے بولا "دادی امّاں، چلیے، آپ کے گھر چھوڑ آؤں۔"

یہ بُڑھیا، اصل میں، پرستان کی پری تھی۔ مُفت کی کھا کھا کے موٹی ہو گئی تھی، اِس لیے لاہور کے ایک بیُوٹی پارلر میں سلِمنگ کورس کرنے آئی تھی۔ اُس نے سوچا، کوئی نیک آدمی مِلے تو اُسے اِنعام دیتی جاؤں۔ چُناں چہ اُس نے بُڑھیا کا بھیس بدلا اور لکڑیاں چُننے لگی۔ وہ للّو کے برتاؤ سے بہُت خُوش ہُوئی، اُسے ڈھیروں دُعائیں دیں اور بولی "بیٹا، تو بہُت اچھّا لڑکا ہے۔ تُو نے میرا دل خُوش کر دیا۔ اب میں تُجھے خُوش کرُوں گی۔"

یہ کہ کر اُس نے تالی بجائی۔ پلک جھپکتے میں وہاں ایک گدھا آ کر دُم ہلانے لگا۔ بُڑھیا بولی "بیٹا، یہ تیری نیکی کا اِنعام ہے۔ اِسے گھر لے جا۔ جب تُجھے پیسوں کی ضرُورت ہو، اِس کا کان مروڑنا اور خُدا کی قُدرت کا کرِشمہ دیکھنا۔"

للّو گدھے کو لے کر واپس گھر کی طرف چل پڑا۔ اب شام ہو گئی تھی، اور اُس کا گاؤں دُور تھا۔ راستے میں ایک گاؤں پڑا، جِس میں ایک سرائے تھی۔ للّو نے سوچا، رات اِس سرائے میں بسر کرُوں۔ صُبح ہوتے ہی روانہ ہو جاؤں گا۔ اُس نے سرائے کے مالِک سے چارپائی اور بستر مانگا اور کھانا لانے کے لیے کہا۔ مگر سرائے والے نے اُسے پھٹے حالوں دیکھ کر اِنکار کر دیا اور بولا "پہلے پیسے دو۔ پھر بستر اور کھانا مِلے گا۔"



للّو کو بڑا غصّہ آیا۔ اُس نے کہا "تم مجھے کنگال سمجھتے ہو؟ یہ دیکھو۔" یہ کہا اور جھٹ گدھے کا کان مروڑ دیا۔ گدھے کے مُنھ سے کھن کھن رُوپے گرنے لگے۔ سرائے والے کی چُندھی آنکھیں حیرت سے کُھل گئیں، اور اُس کے من میں بے ایمانی نے گھر کر لیا۔ جب للّو کھانا کھا کر سو گیا تو اُس بے ایمان نے للّو کا گدھا تو چپکے سے اُڑا لیا، اور اُس کی جگہ بالکل ویسا ہی ایک اور گدھا باندھ دیا۔

دُوسرے دن للّو، گدھا لے کر، خُوش خُوش گھر پہنچا اور باپ سے بولا "دیکھو بابا! ایسی چیز لایا ہُوں کہ تمھارے سارے دِلدّر دُور ہو جائیں گے۔ اِس گدھے کا کان مروڑو اور جتنے چاہے رُوپے بٹورو۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری، رنگ چوکھا آئے۔"

یہ کہہ کر اُس نے گدھے کا کان مروڑا۔ مگر بجائے اِس کے کہ گدھے کے مُنھ سے رُوپے جھڑتے، اُس نے زور سے دولتّی ماری اور ڈھینچوں ڈھینچوں کر کے سارا گاؤں سر پر اُٹھا لیا۔ للّو کو بہُت دُکھ ہُوا۔ وہ دِن تو اُس نے روتے دھوتے گُزارا، اور دُوسرے دِن صُبح ہوتے ہی پھر سفر پر روانہ ہو گیا۔

اِس مرتبہ اُسے ایک گاؤں میں ایک بڑھئی مِلا۔ اُس نے للّو کو اپنے ہاں نوکر رکھ لیا۔ للّو نے اُس کی جی جان سے خدمت کی، جس سے وُہ بہُت خُوش ہُوا اور اُسے ایک چھوٹی سی میز دے کر بولا "یہ تُمھاری خدمت کا صِلہ ہے۔ جب تُم اِس سے کہو گے، میز ری میز، کھانا دے تو یہ قسم قسم کے لذیذ اور مزے دار کھانوں سے بھر جائے گی۔" یہ بڑھئی دراصل ایک پری زاد تھا۔ اور گرمیوں کی چھٹّیاں گزارنے وہاں آیا تھا۔

بس جناب، للّو نے میز کندھے پر رکھی اور خُوش خُوش گھر کی طرف روانہ ہُوا۔ مگر اب کے بھی وُہی ہُوا جو پہلے ہُوا تھا۔ رات کو وُہ پھر اُسی سرائے میں ٹھہرا، اور سرائے والے سے کھانا لانے کے لیے کہا۔ سرائے والے نے پیسے مانگ لیے۔ اُس نے کھانے سے پہلے پیسے تو نہ مانگے لیکن اِسی وقت للّو کو ہچکیاں آنے لگیں۔ اُس نے سرائے والے کا کھانا نہیں لیا اور میز کو حکم دیا "میز ری میز، کھانا لا!"

کہنے کی دیر تھی کہ میز قسم قسم کے لذیذ اور مزے دار کھانوں سے بھر گئی۔ للّو بے وقُوف نے پرستان کا یہ کھانا سرائے والے کو بھی کھلایا اور لمبی تان کر سو گیا۔ آدھی رات کو اُس بے ایمان سرائے والے نے للّو کی میز تو چرا لی اور اُس کی جگہ اُس جیسی دوسری میز رکھ دی۔

دُوسرے دن للّو ہنستا، کِھل کھلاتا، گھر پہنچا اور باپ کو ساری بات بتائی۔ مگر جب اُس نے میز کو کھانا لانے کا حُکم دیا تو وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ کھانا تو بڑی بات ہے، اُس پر مکّھی تک آ کر نہ بیٹھی۔

کِسان نے کہا "بیٹے، اِس جادُو کے چکّر سے نکلو، اور محنت مزدوری کر کے پیسے کماؤ۔ اِتنے دِن یُوں ہی ضائع ہو گئے۔ اگر ہم نے زیادہ دیر کی تو چودھری منگنی توڑ دے گا، اور زیبو یُوں ہی بیٹھی رہے گی۔ لوگ کہیں گے کہ لڑکی ہی میں کوئی عیب ہے جو چودھری نے منگنی توڑ دی ہے۔"

دُوسرے دِن للّو نے پھر باپ سے اِجازت لی اور گھر سے نکل کھڑا ہُوا۔ کچھ دُور گیا تھا کہ کیا دیکھتا ہے، ایک بُوڑھا پھُونس آدمی، سر پر ایک بھاری گٹھڑی رکھے، ہانپتا کانپتا چلا جا رہا ہے۔ للّو کو اُس پر ترس آ گیا۔ اُس نے گٹھڑی خود اُٹھا لی اور بُوڑھے کو اُس کے گھر چھوڑ آیا۔ بُوڑھا بہُت خُوش ہُوا۔ بولا "تُم بہُت نیک اور رحم دِل لڑکے ہو۔ میں تُمھیں اِس نیکی کا اِنعام دینا چاہتا ہُوں۔"

یہ بُوڑھا، اصل میں، ایک نیک اور خدا ترس جن تھا۔ اُس نے صندوق میں سے ایک موٹا سا ڈنڈا نکالا اور بولا "اِس کا نام مولا بخش ہے۔ جب تم کو کوئی دشمن ستائے تو اِس سے کہنا، چل میرے ڈنڈے۔ اور یہ ڈنڈا مار مار کر اُس کا بلیتھن نکال دے گا۔"

للّو نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا، اور ڈنڈا لے کر واپس گھر کی طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے شام ہُوئی تو راستے میں وہی سرائے پڑی جس میں وہ دو دفعہ ٹھہرا تھا۔ اُس نے سرائے میں پہنچتے ہی ڈنڈا نکالا اور سرائے والے کی طرف اشارہ کر کے بولا "چل میرے ڈنڈے۔"

تو جناب، یہ کہنا تھا کہ ڈنڈا سرائے والے پر پل پڑا، اور مار مار کے اُس کا کچومر نکال دیا۔ آخر اُس نے ہاتھ جوڑے، معافی مانگی اور للّو کو اُس کا گدھا اور میز واپس کر دی۔ اب للّو کے پاس جادُو کی تین چیزیں تھیں۔ وہ انھیں لے کر خوش خوش گھر پہنچا اور باپ کو گدھے اور میز کے کرتب دکھائے۔ البتہ ڈنڈے کا کرتب نہیں دکھایا۔ اُس کے صرف گُن بتا دیے۔

کسان بولا "چل، بیٹا۔ اب چودھری کے گھر چلیں۔ وہ روز تقاضا کرتا ہے کہ لڑکی کی شادی جلدی کر دو، ورنہ میں کوئی اور لڑکی ڈھونڈتا ہُوں۔"

کسان بیٹے کے ساتھ چودھری کے گھر گیا اور اُس سے کہا "چودھری صاحب، خُدا کے فضل سے، میں نے جہیز کے لیے پچاس ہزار رُوپے کا بندوبست کر لیا ہے، اب شادی کی تاریخ مقرر کر دیجیے۔"

چودھری بڑا لالچی اور کائیاں تھا۔ اُس نے سوچا، بُوڑھے کے پاس کافی مال معلوم ہوتا ہے۔ اِس سے کچھ اور اینٹھنا چاہیے۔ وہ بولا "ٹھیک ہے۔ مگر یہ پچاس ہزار تو کپڑے لتے، برتن بھانڈوں، گہنوں اور برات کے کھانے پر ہی لگ جائیں گے۔ تُمھیں جہیز میں ایک ٹیلیوژن بھی دینا پڑے گا۔ ورنہ شادی نہیں ہو گی۔"

بے چارہ کسان بڑا حیران ہُوا۔ اُس نے کہا "چودھری صاحب، آپ نے پہلے تو یہ بات نہیں کہی تھی۔"

چودھری بولا "پہلے نہیں کہی تھی تو اب کہتا ہُوں۔ مجھے ٹی وی بھی چاہیے، رنگین، جاپان اسمبلڈ۔"

للّو نے اپنے باپ کے کان میں کچھ کہا، اور پھر چودھری سے بولا "ہم آپ کو رنگین ٹی وی بھی دیں گے۔ اور کچھ؟"

چودھری ڈاڑھی کھجا کر بولا "بس پُتر، اور کیا۔ ہاں ۔۔۔ ایک وی سی آر بھی ہو تو اچھا ہے۔ آخر شادی کی فلم بھی تو بنے گی۔ ہم اُسے کیسے دیکھیں گے؟"

للّو نے کہا "آپ کو وی سی آر بھی مل جائے گا، چودھری صاحب۔ فکر نہ کریں ۔۔۔ اور شاید اب آپ کار بھی مانگیں گے۔ تو میں نے آپ کے لیے نئے ماڈل کی ایک ٹیوٹا کرولا کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے ڈنڈا نکالا۔ چودھری ڈنڈے کو دیکھ کر چونکا اور بولا "یہ کیا ہے، پُتر؟"

"للّو نے کہا "یہ جی ٹیوٹا کرولا کا اسٹیرنگ ہے ۔۔۔ وہ جس سے کار کو اِدھر اُدھر موڑتے ہیں۔ سمجھے؟"

"سمجھ گیا، پُتر، سمجھ گیا" چودھری نے ہنس کر کہا، اور اپنی پگڑی اُتار کر چارپائی پر رکھ دی۔



للّو نے زور سے کہا "چل میرے ڈنڈے۔" اُس کا یہ کہنا تھا کہ ڈنڈا تڑ تڑ، تڑا تڑ چودھری کی گنجی کھوپڑی پر برسنے لگا۔ چودھری نے دُہائی مچا دی "ہائے! میں مرا۔ ہائے! میں مر گیا۔ ارے لوگو! دوڑو۔ مجھے اِس شیطانی چرخے سے بچاؤ۔"

جادُو کا ڈنڈا چودھری کی چندیا پر طبلہ بجا رہا تھا اور وہ درد کے مارے بلبلا رہا تھا۔ آخر اُس نے کسان کے پیروں پر سر رکھ دیا اور رو رو کر بولا "میرے بھائی، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ ایک مہینے بعد برات لے کر آؤں گا، اور جو کچھ تم خُوشی سے دو گے، لے لُوں گا۔ میری توبہ! اب خُدا کے لیے اِس شیطانی ڈنڈے کو روکو۔"

تو بھئی، اِس طرح چودھری کو اُس کے لالچ کی سزا ملی اور مہینے بعد للّو کی بہن کا چودھری کے بیٹے کے ساتھ بیاہ ہو گیا۔ کسان نے سارے گاؤں کی دعوت کی اور انھیں ایسے مزے دار کھانے کھلائے کہ وہ آج تک انگلیاں چاٹتے ہیں۔



6 ستمبر

راز یوسفی

پاکستان کی سلامتی کے لیے دو موقعے کڑی آزمائش کے گزرے ہیں۔ پہلا موقع وہ تھا جب پاکستان بن رہا تھا، اور دُوسرا موقع وہ تھا جب 6 ستمبر 1965ء کو بھارت نے پاکستان پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ مگر دونوں مرتبہ دشمن نے مُنھ کی کھائی اور پاکستان بخیر وخُوبی ان آزمائشوں سے گُزر گیا۔

پہلی آزمائش کے موقع پر تو پاکستان قائم ہُوا، اور دُوسری آزمائش کے موقع پر اُس کے جسم میں نئی جان پڑی اور اِس طرح وُہ ایک ایسا چراغ بن گیا جسے کبھی پھونکوں سے نہیں بُجھایا جا سکتا۔

دُشمن کے ناپاک اِرادوں کو خاک میں ملانے کے لیے ستمبر کی 17 روزہ جنگ میں پاکستان کی بہادُر فوجوں نے شجاعت کے جو جوہر دکھائے، وُہ پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ سُنہری حرُوف میں لکھے جائیں گے۔

10 ستمبر کی صُبح، توپوں کی گھن گرج کے ساتھ نمودار ہُوئی تھی۔ سیال کوٹ کے علاقے میں، چونڈا کے گاؤں کے قریب، پاکستان اور بھارت کی فوجوں کے درمیان زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ دُشمن نے چھ سو ٹینکوں اور تین ڈویژن فوج کے ساتھ پاکستان کی سرحدوں پر حملہ کیا تھا۔ مگر پاکستان کے جیالے سپاہیوں کے آگے اُس کی کوئی پیش نہ جاتی تھی۔

جنگ زور و شور سے جاری تھی۔ [illegible] کر رہا تھا۔ لیکن شیر دِل پاکستانی فوجی [illegible] تھے، اور دُشمن جہاں بھی سر اُٹھاتا تھا۔ [illegible]

اِسی محاذ پر، مشرق کی جانب۔ [illegible] دستہ سرحد کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ [illegible] پائی تھی اور مورچوں میں بیٹھے ہُوئے [illegible] تھے کہ سرحد پار سے اُنھیں [illegible]

یہ اُڑتی ہُوئی گرد [illegible] فوج آ رہی ہے۔ یہ بات [illegible] کمانڈر نے اندازہ لگا لیا تھا کہ [illegible] کے صرف ایک دستے سے [illegible]

پاکستانی کمانڈر کی پیشانی پر [illegible] ڈُوب گیا۔ تمام سپاہی مورچوں میں [illegible] سوچنے لگے کہ اِس حملے کا کس طرح [illegible]

گرد کا اُمنڈتا ہُوا بادل بڑی تیزی سے [illegible]



تھا۔ اِس سرحد پر بچاؤ کے انتظامات کچھ زیادہ نہیں تھے۔ اِس لیے پاکستانی کمانڈر اِس فکر میں ڈوبا ہُوا تھا کہ اگر اِس مقام پر دُشمن کو نہ روکا گیا تو وُہ بڑی آسانی سے پاکستانی سرحد میں گُھستا چلا آئے گا، اور چونڈا کے محاذ پر جیتی ہُوئی جنگ ہار میں بدل جائے گی۔

وُہ ہیڈکوارٹر سے مدد بھی مانگ سکتا تھا، مگر مدد پُہنچنے تک دُشمن کو روکے رکھنا اِن مُٹھی بھر سپاہیوں کے بس کی بات نہ تھی۔ ابھی وُہ اِنھی سوچوں میں گُم تھا کہ ایک زور دار دھماکا ہُوا اور دُشمن کی طرف سے پھینکا ہُوا ایک گولا اُن کے قریب آکر گرا۔ تمام سپاہی جلدی سے مورچوں میں چلے گئے لیکن کمانڈر وہیں کھڑا رہا۔

"میجر صاحب، مورچے میں آجائیے" ایک سپاہی نے چلّا کر کہا۔

"نہیں۔ مجُھے اپنی جان سے زیادہ اپنے وطن کی سرحدوں کی حِفاظت کا خیال ہے۔ دُشمن تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔" میجر نے جواب دیا۔

"اِس کی فِکر نہ کیجیے" سپاہی بولا "مَیں نے اِس کا حل سوچ لیا ہے۔"

"کیا حل سوچا ہے، تُم نے؟" میجر نے دریافت کیا۔

"مَیں توپچی ہُوں، جناب" سپاہی بولا۔

"جلدی بتاؤ، جوان۔ یہ میں جانتا ہُوں کہ تُم توپچی ہو۔"

"مجُھے ایک جیپ اور ایک ڈرائیور کی ضرُورت ہے" سپاہی نے کہا۔

"یہ اِنتظام ہو سکتا ہے" میجر بولا "مگر اِس کا نتیجہ کیا ہو گا؟"

"دُشمن ایک اِنچ آگے نہ بڑھ سکے گا، جناب" سپاہی نے کہا۔

"کیا کہتے ہو؟" میجر کو غُصّہ آگیا۔

"ایک ایک سکنڈ قیمتی ہے، میجر صاحب" سپاہی بولا "دُشمن ہماری سرحد میں گُھس آیا تو ہم کچھ نہ کر سکیں گے۔ مَیں اُس کی صفوں کو توڑنے کے لیے پیچھے سے حملہ کروں گا۔ جلدی سے ایک جیپ کا اِنتظام کیجیے اور اُس میں ایک ٹینک شکن توپ لگوا دیجیے۔ پھر دیکھیے میں کیا کرتا ہُوں۔"

دُشمن کی طرف سے لگا تار گولوں کی بارِش ہو رہی تھی۔ مگر پاکستانی سرحدی دستہ، خاموشی سے، آنے والے وقت کا اِنتظار کر رہا تھا۔ وہ دُشمن کو یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کچھار میں شیر چُھپے بیٹھے ہیں، اور حملہ آوروں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے چین ہیں۔

کمانڈر کا حُکم ملتے ہی ایک جیپ میں ٹینک تباہ کرنے والی توپ لگا دی گئی۔ توپچی توپ کے دستے پر مضبُوطی سے ہاتھ جما کر جیپ کے پچھلے حِصّے

میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے جیپ سٹارٹ کی اور وہ پلک جھپکتے میں میجر کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میجر کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں توپچی کی جواں مردی کی تعریف کر رہا تھا اور دُعا مانگ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ اُس کی آبرو رکھے اور اُسے اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔

توپچی کی جیپ ایک ویران راستے پر بھاگی جا رہی تھی۔ کئی مرتبہ دُور سے اُس پر گولیوں کی بوچھاڑ بھی پڑی مگر اُس کی رفتار میں فرق نہ آیا۔ ڈرائیور بڑی پھرتی سے جیپ کو اُونچے نیچے اور ٹیڑھے میڑھے راستوں پر بھگائے لیے جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک گھنا جنگل آ گیا۔ توپچی نے ڈرائیور سے کہا "جیپ روک لو۔ ہم یہیں سے اپنی کارروائی شروع کریں گے۔ تم نیچے اُتر کر کہیں چھپ جاؤ۔ جیپ کا انجن بند نہ کرنا۔ شاید ہمیں پیچھے ہٹنا پڑے۔"

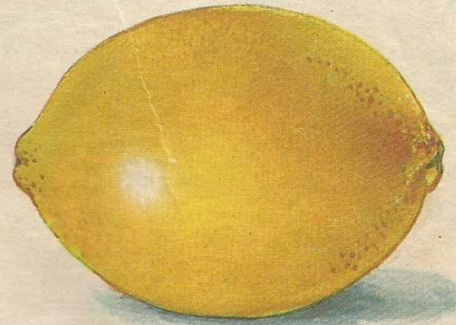
ڈرائیور نیچے اُتر کر ایک گڑھے میں چھپ گیا۔ درختوں کے جھنڈ سے پرے دُشمن کی فوج سیلاب کی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔ اب زیادہ انتظار خطرناک تھا۔ توپچی نے خُدا کا نام لے کر پہلا گولا چلایا جو ٹھیک نشانے پر بیٹھا اور دُشمن کے ایک ٹینک کا صفایا ہو گیا۔ پھر آگے پیچھے گولوں کا تانتا بندھ گیا اور تین چار ٹینک اور ناکارہ ہو گئے۔ دُشمن کے بڑھتے ہُوئے قدم رُک گئے۔ اُس کی صفوں میں گھبراہٹ پھیل گئی۔ پچھلے دستے پیچھے کی طرف ہٹنے لگے۔ اگلے دستوں کے دلوں میں یہ خوف سما گیا کہ پاکستانی فوج نے دائیں طرف سے حملہ کر دیا ہے۔

اب دُشمن کی فوج کے دستوں نے اُس طرف بڑھنا شروع کیا جدھر پاکستانی توپچی گولے برسا رہا تھا۔ مگر وہ اتنی پھرتی سے [illegible] تھا کہ دشمن کا ایک ٹینک بھی اُس طرف نہ آسکا۔

دو گھنٹے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور جب توپچی کو یقین ہو گیا کہ دشمن کی پیش قدمی رُک گئی ہے تو اُس نے ڈرائیور کو آواز دی "رحیم گل، باہر نکل آؤ۔ ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔"

رحیم گل جلدی سے باہر نکلا اور تیزی سے جیپ [illegible] دشمن کے علاقے سے باہر نکل آیا۔ اِدھر پاکستانی سرحد پر [illegible] جو اُس دستے کی مدد کے لیے آئی تھی، مورچے کھود رہی تھی۔ [illegible] کے پاس پہنچا اور جیپ سے اُتر کر سیلوٹ کرنا چاہتا تھا کہ [illegible] اُسے گلے لگا لیا۔

"نیاز گل!" میجر نے کپکپاتی ہُوئی آواز میں کہا [illegible] اور جب تک تُم جیسے جانباز ہماری فوج میں [illegible] شکست نہیں دے سکتا۔"



ایک لیموں ہزار فائدے

لیموں یا نبّو۔ مزے میں کھٹا۔ فائدے میں میٹھا۔ پھل کہہ لیں یا سبزی۔ نام میں کیا رکھا ہے۔

صحت و تن دُرستی کے لیے لیموں قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت ہے، اور اِس کے بے شُمار فائدے ہیں۔ سب سے [illegible] سی پایا جاتا ہے جو ہماری صحت کے لیے بہت [illegible]

صُبح اُٹھتے ہی، نہار مُنھ، ایک گلاس [illegible] اس سے بدن کی چربی گھُلے گی۔ موٹاپا دُور ہوگا۔ [illegible] کبھی بدہضمی نہ ہوگی۔ خُون صاف ہوگا [illegible] لوگوں کو لو بلڈ پریشر کی شکایت ہے، اُنھیں [illegible]

سر میں درد ہو تو آدھے گلاس پانی میں [illegible] چٹکی بھر بائی کاربونیٹ آف سوڈا مِلا کر پی لیں۔ [illegible] نزلہ یا زُکام ہو تو پہلے گرم پانی سے نہائیں۔ [illegible] نبّو کا رس اور چمچہ بھر شہد ملا کر پیئیں۔ نہ نزلہ رہے گا نہ زکام۔

نبّو قبض کے لیے بھی مُفید ہے۔ رات کو چمچہ بھر [illegible] آدھے گلاس پانی میں بھگو دیں۔ اُس میں ایک لیموں [illegible] مُنقّے کھا کر لیموں کا رس مِلا پانی پی لیں۔ قبض دُور ہو جائے گا۔



پہاڑی بکرا

مقبول جہانگیر

میں اور میرا دوست ارشد بُوڑھے شکاری کے پاس بیٹھے تھے اور وُہ ہمیں اپنی زندگی کے عجیب و غریب واقعات مزے لے لے کر سُنا رہا تھا۔ اِتنے میں ایک اجنبی اندر داخل ہُوا۔ اُس کا قد چھوٹا لیکن جسم بڑا مضبُوط اور کسرتی تھا۔ عُمر ساٹھ سال سے کم نہ ہوگی، لیکن نوجوانوں کی طرح چُست اور چالاک دِکھائی دیتا تھا۔

اُس نے کمرے میں آتے ہی زور کا نعرہ لگایا اور شکاری سے لپٹ گیا۔ جب وُہ ایک دُوسرے سے بغل گیر ہو چُکے تو بُوڑھا شکاری ہماری طرف مُتوجّہ ہُوا اور اجنبی کا تعارُف کراتے ہُوئے بولا:

"اِن سے مِلو۔ یہ میرے ایک بہُت ہی عزیز دوست ہیں۔ نیپال کے رہنے والے ہیں اور بہُت اچھّے شِکاری ہیں۔ اِنھوں نے ایک دفعہ میری جان بچائی تھی۔"

ہم نے نیپالی سے ہاتھ مِلایا اور اُس نے ٹُوٹی پُھوٹی اُردو میں ہماری خیریّت پُوچھی۔ اِتنے میں ارشد بول اُٹھا "چچا، آپ نے آج تک ہمیں یہ بتایا ہی نہیں کہ آپ نیپال میں بھی شِکار کھیل چُکے ہیں۔ وہاں کون کون سے جانور پائے جاتے ہیں؟"

یہ سُن کر بُوڑھا شکاری مُسکرایا اور پھر بولا "بھئی، وہاں ویسے تو بہُت سے جانور پائے جاتے ہیں، لیکن ایک جانور ایسا خوف ناک ہے کہ اُسے لوگ شیر اور گینڈے سے زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں۔ اُس کا شِکار بہُت جان جوکھوں کا کام ہے۔ یُوں سمجھو کہ جو شخص زندگی سے اُکتا کر مرنا چاہے تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ نیپال جا کر اس مُوذی جانور کا شکار کھیلے۔ مُشکل ہی سے واپس لوٹے گا۔"

"وُہ کون سا جانور ہے؟" ہم نے حیرت سے پُوچھا۔

"یہ جانور تُم روزانہ کسی نہ کسی جگہ ضرُور دیکھتے ہو گے" بُوڑھا شکاری مُسکرا کر بولا "ابھی میں اس کا نام لُوں گا تو تُم ہنس پڑو گے۔"

ہم دونوں نے بُہتیرا سر مارا لیکن ایسا کوئی جانور ذہن میں نہ آیا۔

"بس ہار گئے؟" بُوڑھے شکاری نے قہقہہ لگا کر کہا "لو سُنو۔ اس مُوذی جانور کا نام ہے، بکرا۔"

"بکرا ــــ!" ہم نے چلّا کر کہا "آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟"

"میں نے پہلے ہی کہ دیا تھا کہ تُم اِسے مذاق سمجھو گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نیپال کا یہ بکرا اِتنا خوف ناک اور خُونی ہوتا ہے کہ آدمی کی جان لیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ نام کا تو بکرا ہے، لیکن ڈیل ڈول اور قد کاٹھ میں گدھے کے برابر بلکہ اس سے بھی کُچھ اُونچا ہی ہوتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے، نوکیلے سینگ اِنسان کے جسم میں نیزے کی طرح کُھب جاتے ہیں۔ اُونچی پہاڑیوں کی تنگ گُزر گاہوں میں، جہاں دونوں طرف گہری گہری کھائیاں ہوتی ہیں، اِس ظالم سے آمنا سامنا ہو جائے تو اس کی ایک ہی ٹکّر آدمی کو کھائی میں گِرا دینے کے لیے کافی ہے۔

"نیپال ایک چھوٹا سا مُلک ہے، جو کوہ ہمالیہ کے دامن میں آباد ہے۔ ہمالیہ دُنیا کا سب سے بلند پہاڑی سِلسلہ ہے اور افغانستان سے کشمیر، بھارت، نیپال اور بھوٹان تک پھیلا ہُوا ہے۔ اِس سِلسلۂ کوہ کی لمبائی، مشرق سے مغرب تک، تقریبًا 1500 میل اور چوڑائی اوسطًا 100 میل ہے۔ اس میں بہُت سی اُونچی اُونچی چوٹیاں ہیں، جن میں ایورسٹ دُنیا کی سب سے اُونچی چوٹی ہے (تقریبًا 29,028 فُٹ بلند)۔ یہ چوٹیاں ہر وقت برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ ان میں سے بعض چوٹیوں پر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے پودے اور گھاس اُگتی ہے، اور پہاڑی بکرا یہیں

پایا جاتا ہے۔

"ان بکروں کی گردنیں بڑی قیمت پاتی ہیں۔ انھیں دولت مند لوگ اپنے ڈرائنگ رُوموں میں سجاتے ہیں۔ نیپالی لوگ غریب ہیں۔ انھیں بکروں کی گردنوں سے کافی آمدن ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ بچپن ہی سے پہاڑوں پر چڑھنے کی مشق کرتے ہیں اور ان کا ہتھیار صرف ایک چاقو ہوتا ہے، جس سے یہ بکرے کا شکار کرتے ہیں۔

"جن دنوں میں ریاست میسور کے مہاراجا کا مہمان تھا، تو ایک نیپالی شکاری مہاراجا کے لیے دو پہاڑی بکروں کے سر لے کر آیا۔ مہاراجا نے دونوں سر دو ہزار رُوپے میں خرید لیے، اور پھر نیپالی شکاری سے میرا تعارف کرایا۔ اُس کا نام میکن تھا۔ بڑا خُوش مزاج اور سادہ دل شخص تھا۔ جلد ہی ہم دونوں بے تکلّف دوست بن گئے۔

"ایک دن میکن نے، باتوں باتوں میں، مجھے نیپال آنے کی دعوت دی۔ وُہ نیپال کے دارُالسّلطنت کھٹمنڈو میں رہتا تھا۔ میں پہاڑی بکروں کو دیکھنے کا اتنا مشتاق تھا کہ فوراً اُس کی دعوت قبول کر لی اور چوتھے دن مہاراجا سے اجازت لے کر اُس کے ساتھ نیپال روانہ ہو گیا۔

"کھٹمنڈو پہنچنے کے بعد تین دن تو ہم نے آرام کیا اور چوتھے دن بکروں کے شکار کو نکل کھڑے ہُوئے۔ ہمارے پاس رائفلوں کے علاوہ شکاری چاقو بھی تھے۔ میکن کے گھر سے چند میل دُور پہاڑیاں شرُوع ہو جاتی تھیں۔ راستے میں ایک جھیل پڑتی تھی۔ ہم نے کشتی کے ذریعے جھیل کو پار کیا اور پھر پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ اُس کی بلندی آٹھ ہزار فُٹ کے لگ بھگ ہو گی۔ میکن آگے آگے جا رہا تھا۔ مجھے پہاڑی پر چڑھنے کی مشق نہ تھی، اس لیے میری رفتار سُست تھی۔ کہیں کہیں تو پتھر اتنے چکنے تھے کہ ہاتھ پھسل پھسل جاتا تھا۔ جُوں جُوں ہم اُوپر چڑھتے گئے، پہاڑی دُشوار گزار ہوتی گئی۔ ایک جگہ ٹھہر کر میکن نے اپنے تھیلے میں سے دُور بین نکالی اور آنکھوں پر لگا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"دوپہر کو گیارہ بجے ہم نے ایک کُشادہ جگہ سفری تھیلے اُتارے، کھانا کھایا اور تھرموس سے چائے نکال کر پی۔ میں پہاڑی کی چڑھائی سے تھک کر چُور ہو گیا تھا۔ کھانا کھا کر وہیں لیٹ گیا اور میکن دُور بین سنبھال کر اُوپر چڑھنے لگا۔ لیکن چند فُٹ اُوپر جا کر وُہ واپس آ گیا اور کُچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک رُک گیا۔ اُس کی نگاہیں آہستہ آہستہ مُڑ کر دائیں جانب، کافی اُوپر، ایک تنگ راستے پر پڑیں۔ میری نگاہوں نے بھی اُس کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور ـــــ تب میں نے دیکھا کہ دُور دو سفید سے دھبّے سُورج کی روشنی میں چاندی کی طرح چمک رہے ہیں۔

"میکن نے بڑبڑا کر دُور بین آنکھوں سے لگائی اور بولا "دو بکرے ـــ میرا خیال ہے، نر اور مادہ ہیں۔"

"یہ کہہ کر اُس نے دُور بین مجھے تھما دی اور میں نے بھی ان بکروں کو دیکھ لیا۔



وُہ ہم سے تقریباً چھ سو گز کے فاصلے پر تھے۔ [illegible] کر ہم دونوں خاموشی سے اُوپر چڑھنے لگے۔ سو گز قریب پہنچ کر ہم رُک گئے۔ یہاں سے دونوں بکرے صاف دِکھائی دے رہے تھے۔ میکن نے [illegible] لیکن نشانہ خالی گیا۔ میں نے فوراً دُور بین سے بکروں کو دیکھا اور پھر نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی بکری کے لگی اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔

"میکن خُوشی سے چلّا اُٹھا۔ اُس نے اپنی رائفل [illegible] پھرتی سے پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ میں بھی گرتا پڑتا اس کے پیچھے [illegible] میکن مُردہ بکری کے قریب پہنچ گیا۔ یہ راستہ [illegible] خوفناک کہ رُوح کانپ جاتی تھی۔ اُس کے دونوں طرف [illegible] کھائیاں تھیں۔

"میکن نے جُھک کر مُردہ بکری کا سر اپنی جانب [illegible] کہ ایک چٹان کی اوٹ سے بکرا شیر کی مانند دہاڑتا ہُوا [illegible] کو دیکھتا رہا جو میکن کے قریب مُردہ پڑی تھی۔ پھر [illegible] سے پتھروں پر کُھر مارے، اور پھر گردن جُھکا کر حملہ کرنے کے [illegible]

"میکن نے جھٹ آگے بڑھ کر اُس کے [illegible] اُبھری ہُوئی چٹان کے ساتھ جم کر کھڑا ہو گیا۔ بکرے نے [illegible] اُس کے ٹکر ماری اور وہ لُڑھکتا ہُوا کھائی کے کنارے پر پہنچ گیا۔ [illegible] سے کُھر مارنے لگا۔ میکن کا نچلا دھڑ اب ڈھلوان [illegible] کے نیچے لٹک رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میرے ہوش و حواس گُم ہو گئے۔ میں نے [illegible] لیکن فوراً ہی میری پیشانی پسینے سے تر ہو گئی، کیوں کہ [illegible]۔ خیر میں جلدی سے آگے بڑھا اور پیٹی میں سے چاقو نکال کر بکرے پر [illegible] بکرے کی

سفید کھال خون سے رنگین ہو گئی اور وہ چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کی دائیں ٹانگ اور پیٹھ کے پچھلے حصّے پر پے در پے کئی وار کیے۔ وہ پھر چند فٹ پیچھے ہٹ گیا اور گردن موڑ کر اپنے زخموں کو دیکھنے لگا۔

"میں فوراً بکرے کی طرف مُنہ کر کے، پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ ٹانگیں میکن کی طرف بڑھا دیں اور چیخ کر کہا "میری ٹانگیں پکڑ لو!" لیکن بے چارہ میکن سخت کوشش کے بعد بھی ٹانگیں نہ پکڑ سکا۔ اُس کے ہاتھ، جن سے خون ٹپک رہا تھا، بمشکل میرے جوتوں تک پہنچ سکے۔ وہ یکایک ڈگمگایا، اور میرے دیکھتے دیکھتے ہزاروں فٹ نیچے کھائی میں گر پڑا۔ اُس کی دل ہلا دینے والی چیخوں سے اِرد گرد کی پہاڑیاں گونج اُٹھیں اور میرا رُواں رُواں خوف سے کھڑا ہو گیا۔

"اب میری باری تھی۔ بکرے کے زخموں سے خون فوّارے کی طرح نکل رہا تھا اور آس پاس کی پتھریلی زمین سُرخ ہو گئی تھی۔ اب وہ مجھ سے کوئی چھ فٹ کے فاصلے پر کھڑا طیش کے عالم میں بار بار اُچھل رہا تھا۔ میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور



اُس کے حملے کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے اپنے زندہ بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی، کیوں کہ بکرا گینڈے کی مانند طاقت ور تھا اور ایک ہی ٹکر میں مجھے بھی میکن کے پاس پہنچا سکتا تھا۔ پھر بھی زندگی کی آخری بازی کھیلنے کے لیے میں ہر طرح مُستعد تھا۔

"بکرے کی پیٹھ کُبڑی تھی، جو اُس کے جسم کو اور ہیبت ناک بنا رہی تھی۔ اُس کے طاقت ور کندھے غیظ و غضب کے عالم میں زور زور سے ہل رہے تھے۔ اُس نے دھائیں سے اپنا ایک پاؤں پتھر پر مارا اور میری جانب بڑھا۔ میرے پاس صرف چاقو تھا۔ بجلی کی مانند اُچھل کر میں نے پانچ انچ لمبا رام پوری چاقو اُس کی گردن میں گھونپ دیا۔ وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹا اور اپنی گردن کو چاقو سے آزاد کرا لیا۔ لیکن میں اُسے حملے کا موقع دیے بغیر آگے بڑھا اور پھر اُسی جگہ پُوری طاقت سے چاقو گھونپ دیا۔

"بکرے کے حلق سے گاڑھے گاڑھے خون کا ایک سیلاب سا نکل کر چاروں طرف پھیل گیا۔ اُس نے اپنی گردن سے چاقو نکالنے کی بڑی کوشش کی لیکن میں نے اُس کا سینگ پکڑ لیا۔ اُس کا سر اب میرے سینے کو چھو رہا تھا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر اُبھری ہوئی چٹان کا سہارا لیا اور بکرے کی گردن پر دونوں ٹانگیں رکھ کر اُسے زور سے پیچھے دھکیلا۔ جوں ہی وہ پیچھے ہٹا، میں نے چاقو سے اُس کی گردن پر وار کیا۔ اُس نے پُوری قوّت سے ٹکر ماری، اور اگر میں فوراً ہی ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو میری پسلیاں چکنا چُور ہو جاتیں۔

"اب میں نے آہستہ آہستہ پیچھے سرکنا شروع کیا۔ وہ میری نیت کو بھانپ گیا کہ میں فرار ہونا چاہتا ہوں۔ ایک مرتبہ پھر ڈکرا کر آگے بڑھا۔ میں نے جلدی سے چاقو والا ہاتھ آگے کر دیا، اور یہ چاقو اُس کی آنکھ میں کُھب گیا۔ ایک دہشت ناک چیخ مار کر وہ مجھ پر آن پڑا اور میں اُس کے نیچے دب گیا۔

"مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میرے اُوپر منوں بوجھ آن پڑا ہو۔ بکرے میں اب زندگی کے آثار نہ تھے۔ لیکن وہ اِس طرح میرے اُوپر پڑا تھا کہ اگر میں اُٹھنے کی کوشش کرتا تو ہم دونوں نیچے کھائی میں جا گرتے۔ میں نے زور زور سے چلّانا شروع کیا کہ شاید کوئی آدمی قریب ہو اور میری مدد کے لیے پہنچ جائے۔ چناں چہ یہ میرا دوست جو تمھارے سامنے بیٹھا ہے، اس نے میری چیخ پکار سُن لی اور وہاں آ گیا۔ اس نے بکرے کا مُردہ جسم دھکیل کر ایک طرف کیا اور مجھے اُس کے نیچے سے نکالا۔ میرا تمام جسم زخموں سے چُور چُور تھا۔ بڑی مُشکل سے ہم نیچے اُترے تو ایک کھائی میں مجھے میکن کی لاش دکھائی دی۔ اُس کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے تھے۔

"ایک ماہ تک میں کھٹ منڈو کے سرکاری ہسپتال میں پڑا ہائے ہائے کرتا رہا۔ میرا سر پھٹ گیا تھا، بازو کی ہڈّی ٹُوٹ گئی تھی اور سینے میں گہرے زخم آئے تھے۔ اور یہ سب اِس غلطی کی وجہ سے ہُوا کہ میں اپنی رائفل نیچے ہی چھوڑ آیا تھا۔



دیووں کی فوج

پُرانے زمانے کے بادشاہ مُطلقُ العنان ہوتے تھے۔ مُطلق کے معنی ہیں آزاد، اور عنان کہتے ہیں گھوڑے کی لگام کو۔ مُطلقُ العنان کا مطلب ہوا، بے لگام۔ یعنی ایسا بادشاہ جو من مانی کرے اور سب لوگ آنکھیں بند کر کے اُس کا حکم مانیں۔ چاہے وہ حکم غلط ہو یا صحیح۔

اگر کسی بادشاہ کے دماغ میں کوئی خرابی ہوتی تو وہ رعایا کے لیے مُصیبت بن جاتا اور اس کی حرکتوں سے پُورے ملک کی جان عذاب میں آجاتی۔ دُنیا میں ایسے بہت سے جنونی اور خبطی بادشاہ گزرے ہیں۔ ہم آپ کو صرف ایک بادشاہ کا قصّہ سُناتے ہیں۔ اُس کا نام فریڈرک ولیم (اوّل) تھا، اور وہ آج سے ڈھائی سو سال پہلے "پروشیا" کے ملک پر حکومت کرتا تھا۔

فریڈرک ولیم کو ایک عجیب و غریب خبط تھا۔ اُس نے فوج کا ایک ایسا دستہ بنایا تھا جس میں سات سات فُٹ کے جوان بھرتی کیے جاتے تھے، یعنی عام آدمی سے ڈیڑھ دو فٹ لمبے۔ لوگ اُسے دیووں کی فوج کہتے تھے۔

فریڈرک نے یورپ کے تمام ملکوں میں اپنے جاسوسوں کا جال بچھا رکھا تھا، جن پر لاکھوں روپے صرف ہوتے تھے۔ اگر اس کی سات فٹی فوج کا کوئی سپاہی فوت ہو جاتا تو وہ اپنے جاسوسوں کو اس کی جگہ کوئی دُوسرا جوان بھرتی کرنے کا حکم دیتا، اور وہ یورپ کے کسی شہر، قصبے یا گاؤں سے سات فُٹ کا کوئی جوان تلاش کر کے پروشیا بھجوا دیتے۔ کسی کو مُنھ مانگی تنخواہ کا لالچ دیا جاتا اور کسی کو زبردستی پکڑ کر پروشیا پہنچا دیا جاتا۔

ایک دفعہ فریڈرک کی اس انوکھی فوج کا ایک سپاہی مر گیا۔ بادشاہ نے اپنے جاسوسوں کو حکم دیا کہ فوراً کسی دوسرے جوان کا بندوبست کیا جائے۔ جاسوسوں نے یورپ کا چپّا چپّا چھان مارا، پر سات فٹ کا کوئی جوان نہ ملا۔

ایک دِن، اتفاق سے، چند جاسوسوں کا گزر ایک گاؤں سے ہوا۔ یہاں انھیں ایک لمبا تڑنگا بڑھئی (ترکھان) دِکھائی دیا۔ اُنھوں نے بڑھئی سے کہا کہ ہمیں ساڑھے سات فُٹ لمبا ایک صندوق بنا دو۔ جو مانگو گے، دیں گے۔ بڑھئی نے تین چار روز میں صندوق تیار کر دیا۔

جاسوسوں نے صندوق کا مُعاینہ کیا اور پھر سر ہلا کر بولے "یہ $7\frac{1}{2}$ فُٹ لمبا نہیں ہے۔"

بڑھئی بولا "میں ابھی ناپ کر دکھاتا ہوں۔"

جاسوسوں نے کہا ناپنے کی ضرورت نہیں۔ تم ہمیں اس کے اندر لیٹ کر دکھاؤ۔" بڑھئی بھولا بھالا تھا بے سوچے سمجھے صندوق کے اندر لیٹ گیا۔ وہ پورے سات فُٹ کا تھا۔ جاسوسوں نے ایک دم صندوق کا ڈھکن بند کیا، کیلیں ٹھونکیں اور جہاز پر لاد کر پروشیا لے گئے۔

فریڈرک ولیم بہت کنجوس تھا۔ اپنی ذات اور اپنے بیوی بچوں پر کم سے کم پیسہ خرچ کرتا تھا۔ اس کے محل میں گنتی کے چند نوکر تھے۔ گھر کا زیادہ تر کام کاج ملکہ اور شہزادیاں کرتی تھیں۔ مگر وہ اپنے سات فُٹے فوجیوں کے مُعاملے میں بہت سخی تھا۔ اُنھیں وزیروں سے زیادہ تنخواہ ملتی تھی اور وہ بڑے خوبصورت اور آرام دہ بنگلوں میں رہتے تھے۔ ان فوجیوں کا کام صرف اِتنا تھا کہ روز صُبح کو بادشاہ کے سامنے پریڈ کریں۔ دشمنوں سے لڑنے کے لیے الگ فوج تھی۔ سات فُٹے فوجی جنگ کے لیے نہیں بھیجے جاتے تھے۔

اتنے آرام اور آسائش کے باوجُود یہ فوجی خوش نہ تھے، کیونکہ انھیں گھر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اگر کوئی سپاہی بھاگنے کی کوشش کرتا تو اُسے سخت سزا دی جاتی تھی۔

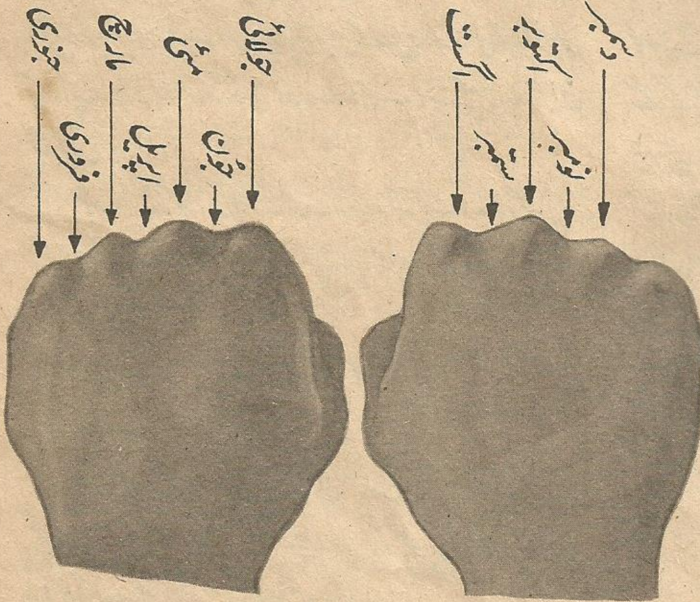
دیووں کی اس فوج میں 2,000 سپاہی تھے، اور ہر سپاہی سات فُٹ لمبا تھا۔ اِس تعداد میں کمی نہیں ہونے دی جاتی تھی۔

فریڈرک ولیم کا اِنتقال ہُوا تو اُس کا بیٹا فریڈرک اعظم، تخت پر بیٹھا۔ اُس نے یہ فوج توڑ دی اور تمام فوجیوں کو انعام واکرام دے کر رُخصت کیا۔

اب چند باتیں پروشیا کے بارے میں سُنیے:

پروشیا پہلے جرمنی کا ایک صُوبہ تھا۔ پھر 1703ء میں آزاد ملک بن گیا۔ فریڈرک اعظم نے اِسے ایک عظیم الشان سلطنت بنایا۔ 1933ء میں جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر نے اسے زبردستی جرمنی میں شامل کرلیا۔ دوسری جنگِ عظیم (جو 1939ء سے 1945ء تک لڑی گئی) میں جرمنی کو شکست ہوئی تو پروشیا کا کچھ علاقہ پولینڈ کو دے دیا گیا۔ پولینڈ جرمنی کا پڑوسی ملک ہے۔ (س ل)

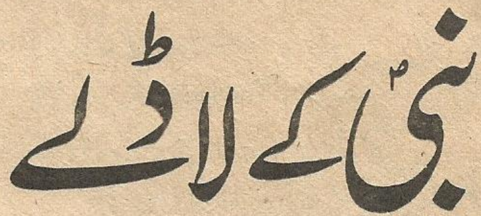
یہ مہینا کتنے دِن کا ہے؟



"بیٹی، ذرا کیلنڈر میں دیکھنا۔ یہ مہینا کتنے دِن کا ہے؟ دُودھ والے کا حساب کرنا ہے" دادی اماں نے عالیہ سے کہا۔

"اے دادی اماں، کیلنڈر میں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ابھی چند سکنڈ میں بتائے دیتی ہوں یہ دیکھیے۔"

یہ کہہ کر عالیہ نے بائیں ہاتھ کی مُٹھی بند کی اور اُنگلیوں کے جوڑوں پر دائیں ہاتھ کی اُنگلی رکھ کر بولی "یہ اُبھرے ہوئے جوڑ اکتیس دن کے ہیں، اور ان کے درمیان جو گڑھے ہیں، یہ تیس دن کے۔ اب اِن جوڑوں اور گڑھوں پر اُنگلی رکھ کر گنتی جائیے: جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست۔ یہ مہینا اگست کا ہے اور اگست جوڑ پر آیا ہے، للذا یہ اکتیس دن کا ہے۔ بارہ مہینوں میں صرف فروری ایسا مہینا ہے جو اٹھائیس یا اُنتیس دن کا ہوتا ہے۔ باقی سب مہینے تیس یا اکتیس دن کے ہوتے ہیں۔



نبیؐ کے لاڈلے

ہمارے نبی حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم بچّوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی یہ محبت اور شفقت مسلمان بچّوں تک محدود نہ تھی۔ آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کافروں کے بچّوں کے ساتھ بھی مہربانی سے پیش آتے تھے۔

ایک دفعہ ایک جنگ میں کافروں کے چند بچّے مسلمانوں کی جھپٹ میں آکر مارے گئے۔ حضورؐ کو خبر ہوئی تو آپ سخت ناراض ہوئے۔ کسی نے کہا کہ یارسولؐ اللہ، وہ کافروں کے بچّے تھے۔ آپ نے فرمایا "کافروں کے بچّے تم سے بہتر ہیں۔ خبردار! بچّوں کو قتل نہ کرو۔ خبردار! بچّوں کو قتل نہ کرو۔"

آپؐ کی خدمت میں جب موسم کا نیا پھل پیش کیا جاتا تو مجلس میں جو سب سے کم عمر بچّہ موجود ہوتا، آپؐ وہ پھل اُسے دے دیتے۔ آپؐ بچّوں کو چُومتے اور اُنھیں پیار کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ اپنے پیارے نواسے حضرت حسن رضؓ کو پیار کر رہے تھے کہ ایک دیہاتی آیا۔ اُس نے حضورؐ سے کہا کہ آپ بچّوں سے لاڈ پیار کرتے ہیں۔ میرے دس بچّے ہیں۔ میں نے آج تک کسی کو پیار نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ تمھارے دل سے محبت چھین لے تو میں کیا کروں؟"

جب آپؐ مکّے سے ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں خوشی کے گیت گا رہی تھیں۔ آپؐ اُن کے پاس رُک گئے اور دریافت کیا "پیاری بچیو، کیا تم مجھے چاہتی ہو؟"

بچیوں نے کہا "ہاں یارسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم۔"

آپؐ نے فرمایا "میں بھی تمھیں پیار کرتا ہوں۔"

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ایک صحابیؓ بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں میں کھجوروں کے باغ میں چلا جاتا اور ڈھیلے مار مار کر کھجوریں گراتا۔ ایک دن باغ کا مالک مجھے پکڑ کر حضورؐ کے پاس لے گیا۔

آپؐ نے مجھ سے دریافت فرمایا "تم ڈھیلے کیوں مارتے ہو؟"

میں نے کہا "کھجوریں کھانے کے لیے۔"

آپؐ نے ارشاد فرمایا "جو کھجوریں [illegible] انھیں اُٹھا کر کھا لیا کرو۔ ڈھیلے نہ مارا کرو۔" یہ کہ کر آپؐ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دُعا دی۔

جب آپؐ سفر سے تشریف لاتے تو راستے میں جو بچّے ملتے اُن کو خود سلام کرتے۔ چھوٹے بچّوں میں سے کسی کو اپنے ساتھ سواری پر آگے پیچھے بٹھا لیتے۔

حضرت انسؓ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خادم تھے۔ [illegible] بچّے ہی تھے کہ اُن کی والدہ انھیں لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی "یارسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یہ میرا بیٹا ہے میں اسے آپؐ کی خدمت میں لائی ہُوں۔ یہ آپؐ کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرے گا اور آپؐ کے پاس رہ کر اِس کی تربیت بھی ہو جائے گی۔"

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ میں کم عمر تھا اس لیے بعض وقت کوئی کام کرنے میں مجھ سے غفلت بھی ہو جاتی تھی۔ ایک بار حضورؐ نے مجھے کسی کام کے لیے بھیجنا چاہا۔ میں نے کہا کہ ابھی نہیں جاسکتا۔ آپؐ نے [illegible] کا اظہار نہیں کیا۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے مجھے کندھوں سے پکڑ لیا۔ [illegible] تو حضورؐ تھے۔ آپؐ نے مسکرا کر میری جانب دیکھا اور پھر بڑے پیار سے کہا "اب تو وہ کام کر دو۔" میں فوراً اُس کام کے لیے روانہ ہو گیا۔ [illegible] حضورؐ کی خدمت کی اور اِس دوران میں ایک بار بھی آپؐ مجھ پر خفا نہیں ہوئے۔

آپؐ ایک دن کسی دعوت میں تشریف لے جا رہے تھے۔ امام حسینؓ راہ میں بچّوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ آپؐ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ امام حسینؓ ہنستے ہوئے آتے اور پاس آ کر نکل جاتے۔ آخر آپؐ نے اُنھیں پکڑ کر سینے سے چمٹا لیا اور فرمایا "حسینؓ میرا ہے اور میں اس کا ہُوں۔"

ایک دن حضرت حسینؓ (یا حضرت حسنؓ) حضورؐ کے کندھوں پر سوار تھے کہ کسی نے کہا "کیا سواری ہاتھ آئی ہے۔" آپؐ نے فرمایا "یہ بھی تو دیکھو کہ سوار کیسا ہے!"

(شیر محمد [illegible])



لالچ کا انجام

عبدالعزیز خالد

سعیدہ نے اپنے چھوٹے بھائی سلمان سے کہا "سلمان، یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ وہ انسان کے تمام رازوں کو بھی جانتا ہے اور اُس کے ذہن میں گھومنے والے خیالات کو بھی، چاہے وہ کسی سے اُن کا ذکر کرے یا نہ کرے۔"

سلمان نے کہا "کیا اللہ میاں ہمیں ایسے خیالات دل میں لانے کی سزا دے گا جن کو ہم نہ تو کسی پر ظاہر کریں اور نہ اُن پر عمل کر کے کسی کو نقصان پہنچائیں؟"

سعیدہ نے کہا "نہیں۔ اللہ تعالیٰ بُرے اعمال کے علاوہ کسی چیز کی سزا نہیں دیتا۔ بلکہ اگر انسان کے ذہن میں کوئی بُری بات آجائے اور وہ اُس پر عمل نہ کرے تو اللہ کو یہ بات بھی بہت پسند ہے، اور اس کی وجہ سے اللہ اُس کی نیکیوں میں ایک نیکی لکھ دیتا ہے۔"

سلمان نے کہا "سعیدہ باجی، کوئی مثال دے کر سمجھائیے۔"

سعیدہ نے کہا "اگر تمھارا کوئی دوست تمھارے ساتھ بُرائی کرے اور تم اُس سے اُس بُرائی کا بدلہ لینے کے بارے میں سوچنے لگو، لیکن پھر اس خیال سے توبہ کر لو اور اُسے معاف کر دو تو اللہ تمھاری اس بات کو بہت پسند کرے گا اور تمھیں اس کا ثواب دے گا۔ اور جو بُرائی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اُسے دُنیا اور آخرت میں اس بُرائی کا بدلہ دیتا ہے۔"

سلمان نے کہا "یہ تو صحیح ہے، لیکن میں ایک ایسے دکان دار کو جانتا ہوں جو ہمارے گھر کے قریب ہی رہتا ہے۔ وہ بڑا لالچی ہے۔ وہ جب دیکھتا ہے کہ کوئی مال اس کے علاوہ اور دکان دار کے پاس نہیں ہے تو وہ اُسے دوگنی چوگنی قیمت پر بیچتا ہے۔ اس طرح وہ بہت امیر ہو گیا ہے۔"

سعیدہ نے کہا "سلمان میاں، کبھی کبھی، شروع میں، ایسا ہوتا ہے، اور یہ اللہ کی طرف سے امتحان ہوتا ہے۔ لیکن آخر کار نتیجہ بُرا ہی ہوتا ہے۔ اللہ اُس کو سزا ضرور دے گا، چاہے کچھ دیر بعد ہی دے۔"

سلمان نے کہا "مجھے ایسی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں جن میں نصیحت اور سبق ہو۔ اگر آپ مجھے اِس قسم کا کوئی قصہ سُنائیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔"

سعیدہ نے کہا "میں تمھیں وہ قصہ سُناتی ہوں جو خُدا کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے روایت ہے۔ ایک دن آپ ایک شخص کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ چلتے چلتے دیر ہو گئی تو دونوں کو بھوک نے ستایا۔ جب وہ ایک بستی کے قریب پہنچے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُس آدمی سے فرمایا "اِس بستی میں جا کر تین روٹیاں خرید لاؤ تاکہ ایک ایک ہم کھالیں اور تیسری سنبھال کر رکھ لیں۔"

وہ آدمی بستی کی طرف چلا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نماز پڑھنے لگے۔ جب وہ شخص روٹیاں لے کر لوٹا تو حضرت عیسیٰؑ کو نماز میں مصروف دیکھ کر سوچنے لگا کہ حضرت عیسیٰؑ نماز پڑھ رہے ہیں۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ میں تین میں سے ایک روٹی کھا لیتا ہوں اور دو اُن کو پیش کر کے کہوں گا کہ بازار میں بس یہی دو روٹیاں تھیں۔ جب حضرت عیسیٰؑ نے نماز ختم کی تو اُس آدمی نے آپ کی خدمت میں دو روٹیاں پیش کر دیں۔

آپ نے پوچھا "تیسری روٹی کہاں ہے؟"

وہ آدمی پریشان ہو گیا۔ پھر ندامت چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "بازار میں بس یہی دو روٹیاں ملی ہیں۔" حضرت عیسیٰؑ یہ سُن کر خاموش ہو گئے۔

دونوں نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ چند گھنٹے گزرے تو اُنھیں پھر بھوک لگنے لگی۔ وہ سوچ ہی رہے تھے کہ کھانے کا بندوبست کیسے کریں کہ اُن کے قریب سے ایک ہرن گزرا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اُس ہرن کو شکار کر لیا اور ذبح کر کے

اُس آدمی سے کہا "لکڑیاں جمع کرو تاکہ ہم اس کا گوشت بھون لیں۔" آدمی لکڑیاں لے آیا اور دونوں نے کھانا تیار کیا۔

کھانے کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے ہرن کی ہڈیوں کو حکم دیا "اے ہرن! اللہ کے حکم سے زندہ ہو جا!" ہڈیاں اللہ کے حکم سے فوراً اکٹھی ہو گئیں۔ اُن پر گوشت چڑھا اور پھر ہرن کھڑا ہو گیا۔

سلمان نے حیران ہو کر پوچھا "کیا یہ ممکن ہے کہ ہرن کی ہڈیاں اکٹھی ہو جائیں، اُن پر گوشت آ جائے، اور وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو کر کھڑا ہو جائے؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے!

سعیدہ نے کہا "اللہ کے کاموں پر حیران مت ہو، سلمان۔ اللہ نے اپنے نبیوں کو معجزے عطا کیے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ، اللہ کے حکم سے، مُردوں کو زندہ کرنا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی وہ آیت یاد ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "میں نے مٹی سے تمھارے لیے پرندوں کے دھڑ بنائے۔ پھر اُن میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے اُڑتے ہوئے پرندے بن جاتے ہیں۔ میں کوڑھیوں اور کوڑھیوں کو ٹھیک کر دیتا ہوں اور اللہ کے حکم سے مُردوں کو زندہ کر دیتا ہوں۔"

سلمان نے کہا "بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اِس کے بعد کیا ہوا؟ اُس آدمی نے حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ دیکھنے کے بعد کیا کہا؟"

سعیدہ نے کہا "وہ آدمی اُس ہرن کو، جس کا گوشت وہ دونوں کھا چکے تھے، زندہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ اور بار بار سُبحان اللہ، سُبحان اللہ کہنے لگا۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُس سے فرمایا "اُس خدا کے واسطے، جس کی تم اتنی تعریف کر رہے ہو، بتاؤ کہ وہ تیسری روٹی کہاں ہے؟"

آدمی پھر پریشان ہو گیا، اُس کا رنگ زرد پڑ گیا اور اُس نے پھر جھوٹ بولا "اے اللہ کے نبیؑ۔ میری بات کا یقین کیجیے۔ بازار میں صرف دو روٹیاں ہی ملی تھیں۔"

دونوں پھر آگے چل پڑے۔ کچھ عرصے کے بعد اُنھیں راہ میں سونے کی تین بڑی بڑی اینٹیں پڑی ملیں۔ اُس آدمی نے خوشی اور مسرت سے چیخنا شروع کر دیا "سونا! سونا! میں اپنا حصّہ لوں گا اور امیر ہو جاؤں گا۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "یہ تین اینٹیں ہیں۔ ان میں سے ایک میری، ایک تمھاری اور ایک تیسری روٹی والے کی ہے۔"

آدمی خاموش ہو گیا اور دل میں کچھ سوچنے لگا۔ پھر کہنے لگا "اے اللہ کے نبیؑ۔ تیسری روٹی والا میں ہی ہوں۔ مجھے معاف کر دیجیے اور مہربانی فرما کر دو اینٹیں مجھے دے دیجیے۔"

حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا "سارا سونا لے لو اور اپنے راستے لگو۔ اب ہم اور تم اکٹھے نہیں رہ سکتے۔"

اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اکیلے جانے لگے۔ اُس آدمی نے سونے کی تینوں اینٹیں لے لیں اور مارے خوشی کے ناچنے لگا۔ اُسی وقت اُدھر سے تین آدمی گزرے۔ اُنھوں نے اُس کے پاس سونا دیکھا تو اُس کو قتل کر کے سارا سونا خود لے لیا۔ پھر وہ وہیں بیٹھ گئے اور اپنے میں سے ایک آدمی کو قریب کی بستی میں کھانا لینے بھیج دیا۔

وہ آدمی کھانا خریدنے چلا گیا تو باقی دونوں نے یہ طے کیا کہ جوں ہی وہ واپس آئے، اُسے قتل کر دیں اور تینوں اینٹیں وہ دونوں لے لیں۔"

سلمان نے کہا "یہ سارے خیالات شیطان کی کارستانی ہیں۔ اُس تیسرے آدمی کا کیا ہوا جو اُن دونوں کے لیے کھانا خریدنے گیا تھا؟"

سعیدہ نے کہا "وہ آدمی بھی لالچی تھا۔ اُس نے سوچا کہ میں اِس کھانے میں زہر ملا دیتا ہوں۔ جب وہ دونوں اسے کھائیں گے تو مر جائیں گے اور میں سارا سونا لے لوں گا۔ جب وہ اپنے ساتھیوں کے پاس کھانا لے کر پہنچا تو اُن دونوں نے اُسے قتل کر دیا تاکہ وہ سونے میں سے اپنا حصّہ نہ لے سکے۔ پھر وہ کھانا کھانے لگے، جس میں زہر ملا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ دونوں بھی فوراً مر گئے۔

تھوڑی دیر بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُس طرف سے گزرے تو دیکھا کہ وہ سب لوگ، اپنے لالچ کی وجہ سے، مُردہ پڑے ہیں اور سونا ویسے کا ویسا پڑا ہے۔ آپ نے فرمایا "یہ دُنیا ہے اور یہ لالچ کا انجام۔"





اِنسان کے من میں ہزاروں سال سے یہ آرزو چٹکیاں لے رہی تھی کہ کسی طرح وُہ چاند ستاروں تک پہنچ جائے اور یہ معلوم کرے کہ وہاں کس طرح کی دُنیا آباد ہے۔ اِس کے لیے ایسے طاقت ور راکٹوں کی ضرورت تھی جو زمین کی کشش سے نِکل کر خلا میں پہنچ سکیں۔ آخر سال ہا سال کی کوششوں کے بعد اِنسان، بیسویں صدی کے وسط میں، ایسے راکٹ بنانے میں کام یاب ہوگیا، اور اُس نے اِن راکٹوں کے ذریعے خلا میں مصنوعی سیّارے چھوڑے۔

ایسا پہلا مصنوعی سیّارہ سپوتنِک۔ا (SPUTNIK -1) تھا، جو رُوس نے 4 ر اکتوبر 1957ء کو خلا میں بھیجا۔ اِس نے زمین سے 588 میل دُور، 18,000 میل فی گھنٹے کی رفتار سے زمین کے گِرد چکّر لگائے۔ اِس قسم کے مصنوعی سیّارے سُورج، ستاروں اور کائنات کی دُوسری چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اِستعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ موسمی تبدیلیوں کے بارے میں بھی زمین پر اطلاعات بھیجتے ہیں، اور اِن کے ذریعے مُختلف مُلکوں کے درمیان ٹیلیفون اور ٹیلیوژن کا رابطہ قائم کیا جاتا ہے۔ یہ مُواصلاتی سیّارے کہلاتے ہیں۔

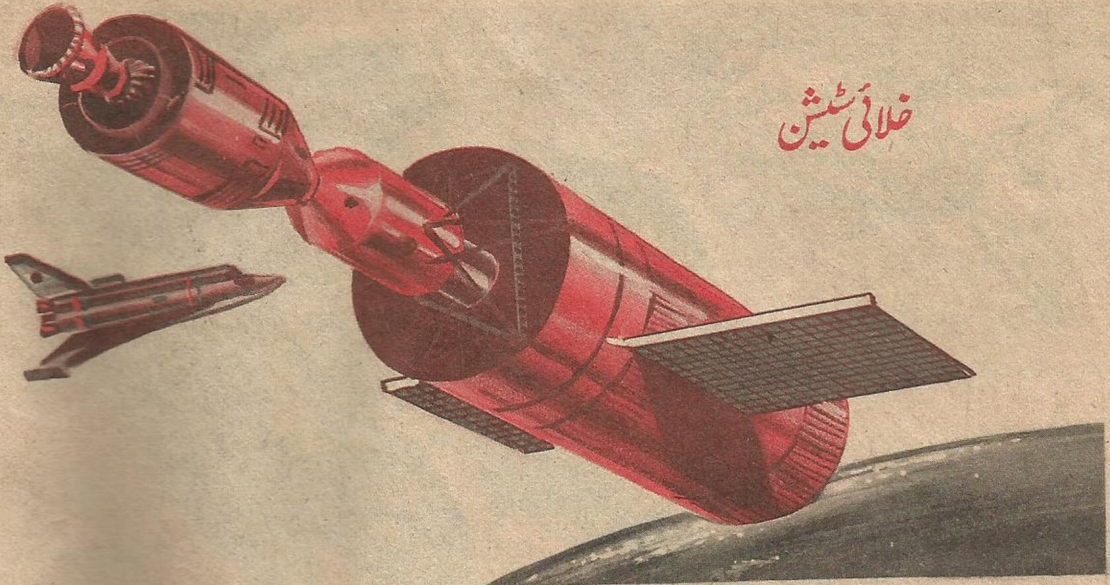
1962ء میں امریکا نے ایک ایسا ہی مُواصلاتی سیّارہ ٹیل سٹار۔1 خلا میں چھوڑا تھا، جس کے ذریعے یورپ اور امریکا کے لوگ ایک دُوسرے کے ٹیلیوژن پروگرام دیکھ سکتے تھے۔ اِس کے بعد امریکا نے اس سے بہتر سیّارہ "ارلی برڈ" خلا میں بھیجا اور اِس کے ذریعے دُنیا کے تمام مُلک مُواصلاتی نظام میں مُنسلِک ہو گئے۔

12 ر اپریل 1961ء کو رُوس نے ایک اور حیرت انگیز کارنامہ دُنیا والوں کو دکھایا۔ اِس دفعہ ایک رُوسی خلا باز، یُوری گیگارن نے خلائی جہاز ووستوک۔1 میں بیٹھ کر زمین کے گِرد چکّر لگایا۔ 1962ء میں ایک امریکی خلا باز، جان گلن کو خلا میں بھیجا گیا۔ اُس نے بھی زمین کے گِرد ایک چکّر لگایا۔

اِس کے بعد رُوسی سائنس دانوں نے خاص قسم کے مصنوعی سیّارے بنائے، جن کے ذریعے اُنھوں نے چاند کی تصویریں اُتاریں۔ اِن مصنوعی سیّاروں کا نام لیونِک (LUNIK) تھا۔ 1959ء میں لیونِک۔3 نے چاند کے اُس حصّے کی تصویریں زمین پر بھیجیں جو ہماری نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ پھر 1960ء سے 1969ء تک رُوس نے کئی مصنوعی سیّارے خلا میں بھیجے جنھوں نے زمین اور چاند کے گِرد چکّر لگا کر مُفید معلومات حاصل کیں۔

اب تک رُوس نے ہی اپنے خلائی کارناموں سے دُنیا کو حیران کیا تھا۔ 1969ء میں امریکا نے اِنسان کو چاند پر اُتار کر دُنیا والوں کی حیرت میں اضافہ کیا۔ 16 ر جولائی 1969ء کو خلائی جہاز اپالو۔11 تین امریکی خلا بازوں (نیل آرم سٹرانگ، ایڈوِن ایلڈرن اور مائیکل کولنز) کو لے کر چاند کی طرف روانہ ہُوا۔ 19 ر جولائی کو یہ جہاز زمین کی کشش سے نِکل گیا۔ 20 ر جولائی کو اس جہاز کی چاند گاڑی "اِیگل" جس میں نیل آرم سٹرانگ اور ایڈوِن ایلڈرن سوار تھے، جہاز کے اندر سے نِکل کر چاند کی سطح پر اُتری اور آرم سٹرانگ نے نیچے اُتر کر چاند کی سطح پر قدم رکھا۔ 15 منٹ بعد

خلائی سٹیشن



ایلڈرن بھی اُس سے آملا۔ مائیکل کولنز اپالو جہاز میں بیٹھا چاند کے گرد چکر لگا رہا تھا۔

دونوں خلا بازوں نے چاند پر اقوامِ متحدہ کا جھنڈا گاڑا اور سائنسی آلات لگائے، اور پھر 21 گھنٹے 37 منٹ چاند پر چہل قدمی کرنے کے بعد 21 جولائی کو، دونوں چاند گاڑی میں سوار ہو کر اپالو میں آ گئے اور 24 جولائی کو اپالو زمین پر آ کر بحرُالکاہل میں اُتر گیا۔ دُنیا کے کروڑوں لوگوں نے اِن کے اِس تاریخی سفر کا حال ٹیلیوژن پر دیکھا۔ اِس کے بعد بھی امریکا نے، وقفے وقفے سے، چھ خلائی جہازوں کے ذریعے اپنے خلا باز چاند پر اُتارے جنھوں نے وہاں سائنسی تجربات کیے اور چاند کی مٹّی کے نمونے لے کر آئے۔

1971ء میں رُوس نے، خلائی چھان بین کے میدان میں، ایک اور بڑا کارنامہ انجام دیا۔ اِس سال اُس نے ایک خلائی سٹیشن خلا میں بھیجا، جس کا نام سیلیوٹ تھا۔ 1972ء میں امریکا نے بھی ایک خلائی سٹیشن "سکائی لیب" خلا میں چھوڑا۔ یہ سٹیشن 1979ء میں زمین پر گر کر تباہ ہو گیا۔ رُوس اب تک چھ سیلیوٹ خلائی سٹیشن خلا میں بھیج چکا ہے۔ 1980ء میں رُوسی خلا بازوں نے سیلیوٹ 6 میں 180 دِن گزار کر خلا میں زیادہ دیر رہنے کا نیا ریکارڈ قائم کیا۔

خلائی سٹیشنوں کا مقصد یہ ہے کہ زمین سے چھوڑے گئے خلائی سٹیشن پہلے اِن سٹیشنوں پر جائیں اور وہاں سے نیا ایندھن لے کر آگے روانہ ہوں۔ اگر کسی خلائی سٹیشن میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو خلائی سٹیشن میں موجود انجینئر اُسے دُرست کر سکتے ہیں۔

چاند کو فتح کرنے کے بعد رُوسی اور امریکی سائنس دانوں نے سُورج کے سیّاروں پر کمند ڈالنے کی تیاری کی اور اِس مقصد کے لیے اُنھوں نے بہُت پیچیدہ اور زیادہ طاقت وَر راکٹ اور مصنوعی سیّارے بنائے۔ امریکا کے ایک خلائی جہاز "میری نر-10" نے سیارہ مرّیخ کی تصویریں اُتار کر زمین پر بھیجیں۔ اِس کے بعد وُہ زہرہ (وینس) اور عطارد (مرکری) کی طرف نکل گیا۔ خلائی جہاز "وائکنگ-1" اور 2 مرّیخ کی سطح پر اُترے اور اُنھوں نے امریکی سائنس دانوں کو بتایا کہ مرّیخ پر کوئی جان دار نہیں ہے۔ امریکا کا خلائی جہاز "پائنیر" اور رُوسی خلائی جہاز "وینیرا" سیّارہ زُہرہ پر اُتر چکے ہیں۔

لیکن سیّاروں کے بارے میں سب سے مُفید معلومات امریکی خلائی جہاز وائیجر-1 اور 2 نے بہم پہنچائیں۔ اُنھوں نے 1979ء میں مُشتری (جیوپیٹر) کے چاندوں کی تصویریں اور 1981ء میں زُحل (سیٹرن) اور اُس کے حلقوں کی تصویریں اُتاریں۔ وائیجر-1 نے تقریبًا 17,000 تصویریں زمین پر بھیجیں۔ وائیجر-2 آگے نِکل گیا اور اُس نے یُورے نَس کی تصویریں اُتاریں۔ خیال ہے کہ یہ خلائی جہاز اگست 1989ء میں نیپچون تک پہنچ جائے گا۔

اب تک جتنے خلائی جہاز بنائے گئے تھے، وُہ صرف ایک ہی دفعہ استعمال ہو سکتے تھے۔ اس کے بعد بیکار ہو جاتے تھے۔ امریکا نے ایک ایسا خلائی جہاز بنایا جسے بار بار خلا میں بھیجا جا سکتا تھا۔ اس کو سپیس شٹل (خلائی نلی) کہتے ہیں۔ ایسی ایک شٹل امریکا نے، 1981ء میں، خلا میں بھیجی۔ جس نے زمین کے گرد 36 چکّر لگائے اور پھر بہ حفاظت واپس آ گئی۔ لیکن اس قسم کی ایک شٹل زمین پر اُترتے وقت تباہ ہو گئی جس سے کئی خلا باز ہلاک ہو گئے۔ اِس پر خلائی شٹل کا پروگرام ترک کر دیا گیا۔

2



بدرُوح

اے حمید

پُراسرار نقاب پہنتے ہی کامران کا لباس بدل گیا۔

پہلے اُس کا سر ننگا تھا اب اُس کے سر پر کالا ہیٹ آگیا۔ جسم پر چمڑے کی جیکٹ اور سیاہ پتلون نظر آنے لگی۔ پاؤں میں سُرخ فل بُوٹ نمُودار ہو گئے۔ کامران اپنے جسم میں زبردست طاقت محسُوس کر رہا تھا۔ اُس کی پیٹی کے ساتھ ایک خنجر بھی لٹک رہا تھا۔ وُہ جبرُو اور اُس کے ساتھیوں کی کلاشنکوف فائرنگ سے بچنے کے لیے بارہ دری کے کھمبے کے پیچھے چُھپا ہُوا تھا۔ غنڈے جیپ کو اُوپر سے گُھما کر کامران کے بالکل سامنے لے آئے۔ جیپ کی روشنی کامران پر پڑی تو ایک غُنڈے نے چلّا کر کہا :

"یہ تو کوئی نقاب پوش ہے، سردار !"

سردار جبرُو کلاشنکوف لہراتا ہُوا جیپ سے کُودا اور بولا :

"یہ وہی لڑکا ہے۔ اِس نے کپڑے بدل لیے ہیں۔ اب یہ بچ کر نہیں جا سکتا۔"

کامران کو ابھی تک پُراسرار نقاب کی طاقت کا اندازہ نہیں ہُوا تھا۔ وہ اپنے اندر ایک جوش اور طاقت ضرُور محسوس کر رہا تھا لیکن کلاشنکوف کی گولیوں کے آگے جاتے ہُوئے گھبرا رہا تھا۔ جبرُو غنڈے نے کلاشنکوف تان لی اور کامران کی طرف دیکھتے ہُوئے گرج دار آواز میں کہا :

"خبردار ! اگر بھاگے تو گولی مار دُوں گا۔"

جبرُو کلاشنکوف گن ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ کامران کی طرف بڑھنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ کہ رہا تھا :

"اب تُم نے نقاب پہن لیا ہے تو کیا ہُوا۔ میں جانتا ہُوں تُم وُہی لڑکے ہو۔ مُجھے تمھاری ہی ضرُورت ہے۔"

کامران کو معلُوم تھا کہ اگر اِن غُنڈوں نے اُسے پکڑ لیا تو اُس کی ساری زندگی خرکار کیمپ میں مُصیبتیں جھیلتے گُزر جائے گی۔ کامران کو ابھی تک معلُوم نہیں تھا کہ اس کے اندر نقاب پہننے سے کتنی زبردست طاقت آچُکی ہے۔ ابھی اُس نے پہلی بار پُراسرار نقاب پہنا تھا، اِس لیے اسے اعتماد نہیں تھا۔ جُونہی جبرو کلاشنکوف گن تانے اُس کی طرف بڑھا، وُہ بارہ دری سے نکل کر قبروں میں دوڑا۔ جبرو نے چلّا کر کہا "رُک جاؤ نہیں تو گولی مار دُوں گا۔"

مگر کامران نہ رُکا۔ اُس پر جیپ کی روشنی ابھی تک پڑ رہی تھی۔ تڑتڑ تڑ گولیوں کے دھماکے ہُوئے۔ جبرو نے کامران کی ٹانگوں پر پیچھے سے فائرنگ کر دی تھی۔ گولیاں کامران کی پنڈلیوں پر آ کر لگیں۔ کامران خوف کے مارے چھلانگ لگا کر ایک قبر کے اُونچے چبوترے کے پیچھے چُھپ گیا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مگر حیرانی کی بات تھی کہ گولیاں اُس کی پنڈلیوں پر لگی تھیں مگر اُسے ذرا سا بھی درد نہیں ہو رہا تھا۔ جبرو اور اس کے ساتھی غنڈے بندوقیں لیے قریب سے گُزر گئے۔ اُنھوں نے کامران کو نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ دُور چلے گئے تو کامران نے ڈرتے ڈرتے اپنی ٹانگوں کو غور سے دیکھا۔ اسے گولیاں پنڈلیوں سے ٹکراتی محسُوس ہُوئی تھیں مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کی ٹانگوں پر نہ گولیوں کا نشان تھا، نہ کہیں سے پتلون پھٹی تھی، نہ خون بہا تھا اور نہ اُسے درد ہی محسُوس ہو رہا تھا۔ یہ کیا کرامات ہے یا خُدا ؟ کامران کو شالینی کی بات یاد آگئی۔ اُس نے کہا تھا "نقاب پہننے کے بعد تُم میں اتنی طاقت آجائے گی کہ تُم اس کا اندازہ نہیں لگا سکو گے" —— کامران کو یقین ہو گیا کہ سچ مُچ یہ پُراسرار نقاب پہننے کے بعد اُس کے اندر اللہ کے حُکم سے کوئی غیبی طاقت آگئی ہے۔ اُس کا

لباس بھی تو بدل گیا تھا۔

کامران قبر کے چبوترے سے باہر نکل آیا۔ بارش اب رُک گئی تھی۔ بادل بھی نہیں گرج رہے تھے۔ کامران نے قبرستان سے آگے درختوں کے گھُپ اندھیرے کی طرف دیکھا تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ اُسے غنڈے واپس آتے نظر آرہے تھے۔ حالانکہ وہاں گہری تاریکی پھیلی ہُوئی تھی۔ اگر کامران نے پُراسرار نقاب نہ پہن رکھا ہوتا تو وہ اِس اندھیرے میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر اب اُسے سب کچھ نظر آرہا تھا۔ وہ اب پُراسرار نقاب پوش بن چکا تھا۔ پنڈلیوں پر گولی لگنے کے باوجود زخم نہ آنے سے اُس میں اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ خُدا نے اُسے وطنِ پاک سے بُرائیاں ختم کرنے کے لیے چُن لیا ہے اور شنالینی کے ذریعے اُسے پُراسرار نقاب دے کر اُس کے اندر بے پناہ غیبی طاقت پیدا کر دی ہے۔ وہ اُٹھ کر سیدھا غُنڈوں کی طرف چلنے لگا۔ جب وہ قبرستان سے باہر درختوں کے نیچے غُنڈوں کے سامنے آیا تو جبرو اور اُس کے ساتھیوں نے اُس کو دیکھ لیا۔ کامران نے للکار کر کہا:

"اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو اور ہتھیار پھینک دو۔"

جبرو نے کلاشنکوف گن کی نالی کا رُخ کامران کی طرف کر دیا اور قہقہہ لگا کر بولا:

"اب میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ جہاں پہلے آٹھ خون کیے ہیں وہاں ایک تیرا خُون اور سہی۔"

اور اِس کے ساتھ ہی جبرو نے کلاشنکوف گن سے ڈزن ڈزن فائرنگ شروع کر دی۔ رات کی خاموش فضا گولیوں کی آوازوں سے گُونج اُٹھی۔ کامران اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ کلاشنکوف کی نالی سے نکل کر ایک ہی ساتھ دس بارہ گولیاں کامران کے سینے پر آکر لگیں۔ مگر کامران یہ دیکھ کر بے حد حیران اور خُوش ہُوا کہ ساری کی ساری گولیاں بڑی آہستہ سے اُس کی جیکٹ سے ٹکرا کر نیچے اُس کے پاؤں میں گر پڑی تھیں۔ جبرو غُنڈے نے جب دیکھا کہ کلاشنکوف کی گولیوں کا کامران پر کوئی اثر نہیں ہُوا اور وہ اُسی طرح کھڑا ہے تو اُس نے کلاشنکوف اپنے ساتھی کی طرف پھینک کر پستول نکال کر کامران پر فائر کر دیا۔ ڈز ڈز ڈز۔ پستول سے تین گولیاں نکل کر کامران کے جسم سے ٹکرائیں اور پہلی گولیوں کی طرح اُس کے جسم سے ٹکرا کر اُسے زخمی کیے بغیر نیچے گر پڑیں۔ جبرو نے چلّا کر کہا:

"اِس نے لوہے کی جیکٹ پہن رکھی ہے۔ اِس کے سر پر فائر کرو۔"

اب جبرو کے ساتھیوں نے رات کے ہلکے اندھیرے میں کامران کے سر کا نشانہ لیا اور دھائیں دھائیں بندوقیں چلانے لگے۔ گولیاں کامران کے سر، گردن، بازوؤں اور شانوں سے ٹکرا ٹکرا کر نیچے گرتی جا رہی تھیں۔ اب کامران کے مُنہ



سے اپنے آپ ایک بلند نعرہ نکل گیا:

"مُلک دشمنوں کے لیے موت!"

یہ نعرہ اِتنا بلند اور گرج دار تھا جیسے بجلی کڑک گئی ہو۔ جبرو اور اُس کے ساتھی اِس نعرے کی گرج سے سہم کر ایک طرف کو بھاگ اُٹھے۔ پُراسرار نقاب پوش کامران اُن کے پیچھے دوڑا۔ غُنڈے اپنی جیپ میں بیٹھے اور اُسے سٹارٹ کر کے تیزی سے قبرستان والے کھیتوں سے نکل کر سڑک پر آگئے۔ پُراسرار نقاب پوش کامران بھی اُن کے پیچھے تھا۔ کامران نے محسوس کیا کہ دوڑتے دوڑتے اُس کے پاؤں اپنے آپ کیچڑ والی گیلی زمین سے بلند ہو رہے ہیں۔ جیسے جہاز رن وے پر دوڑتے ہُوئے ٹیک آف کر رہا ہو۔ کامران کی رفتار اپنے آپ تیز ہوتی گئی۔ پھر وہ اچانک زمین سے دس فُٹ بلند ہو کر ہوا میں اُڑنے لگا۔ کامران یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ درختوں کے اُوپر اُڑتا جا رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ساری طاقت اس میں پُراسرار نقاب کی وجہ سے آگئی ہے۔ ہوا میں اُڑنے کا یہ اُس کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ اِس تجربے کے لُطف میں اتنا گُم ہو گیا کہ

اُسے خبر ہی نہ ہُوئی کہ جبرو اور اُس کے غنڈے جیپ سمیت سڑک پر سے غائب ہوچکے ہیں۔ وُہ بہُت آگے نکل گئے تھے اور آگے جاکر وہ ایک طرف گھُوم کر درختوں کے گھنے ذخیرے میں گھُس گئے تھے جہاں اُن کا زمین کے اندر ایک خفیہ ٹھکانا تھا۔ جبرو اور اُس کے ساتھی زمین دوز خفیہ ٹھکانے میں جاکر چھُپ گئے تھے۔

پُراسرار نقاب پوش کامران بادلوں والی اندھیری رات میں درختوں کے

کامران پُراسرار نقاب پوش کی شکل میں زمین سے پچاس ساٹھ فُٹ بلند ہوکر پرواز کررہا تھا۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو اُسے اُڑتا دیکھ کر نیچے لوگوں کے ہجوم اکٹھے ہو جاتے۔ مگر رات کا وقت تھا۔ سڑکیں بارش میں بھیگنے کے بعد سُنسان ہوگئی تھیں۔ مکانوں کی روشنیاں کامران کے نیچے سے گزر رہی تھیں۔ کامران کو بڑا مزا آرہا تھا۔ مزنگ چونگی کے چوک کو اُس نے روشنیوں سے پہچان لیا۔ وہ بائیں جانب جھُک کر مُڑ گیا۔ اب وہ مزنگ کے محلے



اُوپر اُڑتا ہُوا سڑک کے اُوپر آگیا۔ سڑک پر بجلی کے کھمبوں کی رُوشنی پڑ رہی تھی۔ کامران سڑک کے اُوپر تیس فُٹ کی بلندی پر دونوں بازُو فضا میں پھیلائے عُقاب کی طرح اُڑتا جارہا تھا۔ وہ نیچے بھی دیکھ رہا تھا۔ اُسے غنڈوں کی تلاش تھی۔ مگر غنڈوں کی جیپ اُسے سڑک پر کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سڑک دُور تک خالی تھی۔ کامران کو اپنا جسم بہُت ہلکا لگ رہا تھا اور وُہ بڑی آسانی سے بازُو پھیلائے ہوا میں اُڑتا آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ اُس نے اب نیچی اُڑان شروع کردی۔ رات کا وقت تھا۔ بارش کا طوفان ابھی ابھی رُکا تھا۔ سڑک بالکل خالی تھی۔ کامران پُراسرار نقاب پوش کے رُوپ میں سڑک سے بیس فُٹ بلند ہوکر اُڑ رہا تھا۔ اُس نے سارا علاقہ چھان مارا مگر اُسے جبرُو اور اُس کے ساتھی غنڈوں کا کوئی سُراغ نہ ملا۔ کامران نے سوچا کہ وہ صُبح دِن کی روشنی میں ان غُنڈوں کے ٹھکانے کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گا۔ اُسے اپنے امّی ابّو کا بھی خیال آرہا تھا کہ وہ اُس کے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ چنانچہ کامران وہیں سے ایک چھوٹے ہوائی جہاز کی طرح گھُوم گیا۔ اب اُس نے اپنا چہرہ اُوپر کرکے بازُو کو ہلایا تو وہ عُقاب کی طرح اُوپر کو اُٹھ کر درختوں کے اُوپر آگیا۔ وُہ اور بلند ہوگیا اور تیزی سے مزنگ چونگی کی طرف اُڑنے لگا۔ کیوں کہ اُس کا گھر مزنگ چونگی کے پاس ہی نالے کے پاس تھا۔

کے مکانوں کے اُوپر اُڑ رہا تھا۔ پھر اُسے نالے کے پاس اپنا مکان نظر آیا۔ اُس کے مکان کے ڈرائنگ رُوم کی بتیاں جل رہی تھیں۔ ضرُور اُس کے امّی ابّو بے چینی سے اُس کا انتظار کر رہے ہوں گے اور پریشان بھی ہوں گے۔ کامران نے تیزی سے نیچے کو غوطہ لگایا اور اپنے مکان سے تھوڑی دُور گندے نالے کے پاس ایک درخت کے نیچے اُتر آیا۔ اُس کے پاؤں زمین پر لگ گئے۔ وہ پُراسرار نقاب پوش بن کر اپنے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ پُراسرار نقاب کے راز کو وہ اپنے تک ہی رکھنا چاہتا تھا۔ شنالیبنی نے اُسے تاکید کی تھی کہ وہ یہ راز کسی کو بھی نہ بتائے ورنہ اُس کی غیبی طاقت ختم ہوجائے گی۔

کامران نے جلدی سے اپنی آنکھوں پر سے کالا نقاب اُتار دیا۔ نقاب کے اُترتے ہی اُس کے سر پر رکھا ہُوا خوب صُورت کالا ہیٹ، اُس کی جیکٹ اور شان دار پتلون اور فل بُوٹ ایک دم سے غائب ہوگئے۔ اب وُہ پھر سے ایف اے کا دُبلا پتلا اسٹوڈنٹ بن گیا تھا جس نے نیلی بُش شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ پُراسرار نقاب کامران کے ہاتھ میں تھا اور وُہ اُس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ مخمل ایسے کپڑے کا سیاہ نقاب تھا اور اُس کے درمیان میں ایک سانپ بنا ہُوا تھا جو پھن اُٹھائے کُنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ کامران نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر ایک بھی ستارہ نہیں تھا۔

ہر طرف بادل ہی بادل چھائے ہُوئے تھے۔ کامران کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس کے اندر اتنی زبردست طاقت آ گئی تھی اور وہ آسمان پر اُڑ رہا تھا۔ اس نے کالا نقاب تہ کر کے اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں رکھا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر میں اُس کی امّی اور ابّو سخت پریشان تھے۔ اُس کو دیکھتے ہی اُس کے ابّو اُس پر برس پڑے :

"کہاں تھے تُم ؟ اِتنی دیر کہاں لگا دی ؟ تمھیں گھر والوں کا ذرا خیال نہیں ہوتا ۔"

کامران نے کہا "ابّو، میں کیا کرتا۔ وہیں ہوسٹل میں بیٹھا رہا۔ بارش کا اِتنا طوفان تھا کہ باہر نکلا ہی نہیں گیا۔ اِس میں میرا کوئی قصُور نہیں ۔"

وہ اُنھیں کیسے بتاتا کہ اُس کے ساتھ کیا گزری تھی اور وُہ ابھی تھوڑی دیر پہلے لاہور کے آسمان پر اُڑتا پھر رہا تھا۔ اُس نے اپنے کمرے میں آ کر کپڑے بدلے، پُراسرار کالے نقاب کو اپنے تکیے کے نیچے چُھپا کر رکھ لیا اور بستر پر لیٹ کر دیر تک گزرے ہُوئے پُراسرار واقعات پر غور کرتا رہا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک ایسا کراماتی نقاب اُس کے ہاتھ آ گیا ہے، جس کو پہن لینے سے گولی بھی اُس پر اثر نہیں کرتی اور وہ ہوا میں اُڑ سکتا ہے۔

دُوسرے دن وہ ناشتا کرنے کے بعد کالج گیا تو کالا کراماتی نقاب اُس کی پتلون کی پچھلی جیب میں تھا۔ اپنے دوستوں سے ملنے کے بعد کامران کا بہت جی چاہا کہ وہ انھیں کالا نقاب نکال کر دکھائے اور اُسے پہن کر اُن کے سامنے ہوا میں پرواز کرے لیکن اُسے شنالینی دیوی کی ہدایت یاد آ گئی :

"خبردار! کسی کے آگے اِس نقاب کا ذکر نہ کرنا۔ نہیں تو اِس کی ساری طاقت ختم ہو جائے گی۔"

اور کامران کالے نقاب کی طاقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ ابھی اُس نے اپنے پیارے وطن پاکستان کو جُرم کرنے والوں، چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں، بچّے اِغوا کرنے والوں اور مُلک دُشمن لوگوں سے پاک کرنا تھا۔ شنالینی دیوی کے مجسّمے نے کامران سے یہ بھی کہا تھا کہ وُہ اِس پُراسرار نقاب سے ہمیشہ مُعاشرے سے بُرائیوں کو ختم کرنے کا کام لے۔ اپنی تفریح اور لوگوں کو حیران کرنے کے لیے نقاب کبھی اِستعمال نہ کرے۔ چُناں چہ کامران نے اپنے کسی دوست سے کراماتی نقاب کا ذکر نہ کیا۔ کالج سے چُھٹّی ہوتے ہی وُہ بس میں بیٹھ کر اُس پُرانے قبرستان میں آ گیا جہاں رات کی طُوفانی بارش میں اُسے اِغوا کرنے والے غُنڈوں نے گھیر لیا تھا اور اُس نے قبر میں چھلانگ لگا کر اپنی جان بچائی تھی۔ قبرستان کے بیچ میں رات والی بارہ دری ویسی ہی تھی۔ اُس کے اندر چبوترے پر وہ قبر موجُود تھی جس کے شگاف میں اُس نے چھلانگ لگائی تھی۔ کامران نے غور سے قبر کو دیکھا۔ وہاں ذرا سا بھی کوئی سوراخ نہیں تھا۔ پھر وہ سڑک پار کر کے کھیتوں میں رات والے غُنڈوں کے خفیہ ٹھکانے کو تلاش کرنے لگا۔ مگر اُسے غُنڈوں کا کہیں کوئی نشان نہ ملا۔ کامران [illegible] قبرستان میں سے گزر رہا تھا کہ اچانک آسمان پر کالے کالے بادل چھا گئے۔ بجلی چمکنے لگی اور بارش شرُوع ہو گئی۔ بارش سے بچنے کے لیے کامران کو کھیت کے پاس ایک ٹوٹی ہُوئی حویلی کا کھنڈر نظر آیا۔ وہ اُس کی طرف بھاگا۔ بارش [illegible] موسلا دھار ہو رہی تھی۔ کالے کالے بادلوں سے ایک دم اندھیرا چھا گیا تھا۔ کامران نے حویلی کی ڈیوڑھی میں آ کر جیب سے رُومال نکال کر اپنے بھیگے ہوئے بالوں کو پونچھا۔ پُراسرار نقاب ابھی تک اُس کی پتلون کی پچھلی جیب میں ہی تھا۔ وُہ رُومال کو نچوڑ رہا تھا کہ اُسے کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایک چیخ سے ملتی جُلتی تھی۔ پھر اچانک یہ آواز بند ہو گئی جیسے کسی نے لڑکی کے مُنھ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

کامران ہوشیار ہو گیا۔ اُس نے حویلی [illegible]۔ یہ ایک پُرانی ٹُوٹی پھُوٹی حویلی تھی جہاں کوئی نہیں رہتا تھا۔ [illegible] ایک طرف کھڑا تھا۔ یہ چیخ ڈیوڑھی کے پیچھے سے آئی تھی۔ [illegible]۔ کامران چیخ کی آواز جدھر سے آئی تھی، آہستہ آہستہ اُس طرف [illegible] آگے جا کر ایک تنگ سی گلی بنی ہُوئی تھی۔ اِس گلی میں اندھیرا تھا۔ کامران [illegible] جیسا ذرا آگے گیا تو اُسے بائیں جانب، جہاں ایک [illegible] کے پیچھے سے آدمیوں کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ کامران [illegible] سننے لگا۔ اُس نے ایک آواز کو پہچان لیا۔ یہ اُسی سماج دشمن [illegible] کی تھی۔ وُہ اپنے ساتھی سے دھیمی آواز میں کہ رہا تھا :

"اِس لڑکی کو بے ہوش کر دو۔ نہیں تو یہ [illegible] گی۔ وہ لڑکا تو ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اب اِس لڑکی کو [illegible] جانے دُوں گا۔"

دُوسرے بدمعاش کی آواز آئی "سردار [illegible] بے ہوشی کا ٹیکا لگا دیا ہے۔"

"شاباش!" جبرُو کی آواز آئی "اب [illegible] جیب میں ڈال دو۔ ہمیں شام سے پہلے پہلے رحیم یار خاں والے [illegible] ہے۔"

تیسرے غُنڈے کی آواز آئی "فکر نہ کرو [illegible] شام تک رحیم یار خاں والے پُرانے کنوئیں پر پہنچ جائیں گے۔"

جبرُو نے کرخت آواز میں کہا "[illegible]

کامران بند دروازے سے کان لگائے یہ ساری باتیں سُن رہا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ غنڈے باہر کی طرف آ رہے ہیں تو وُہ جلدی سے وہاں سے ہٹ کر ڈیوڑھی میں آ کر اندھیرے میں چھُپ گیا۔ مگر جبرُو اور اُس کے ساتھی غنڈے اِس طرف نہیں آئے۔ وُہ دُوسرے دروازے سے نکل کر جیپ میں بیٹھے اور جیپ کو لے کر تیزی سے رحیم یار خاں کو جانے والی سڑک کی طرف بڑھے۔ کامران نے جب جیپ کے سٹارٹ ہونے کی آواز سُنی تو سمجھ گیا کہ غنڈے دُوسری طرف سے نکل گئے ہیں۔ مگر اُس کو پریشان ہونے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ اُس کے پاس پُراسرار نقاب موجود تھا۔ وُہ اُسے پہن کر ہوا میں اُڑتے ہُوئے غنڈوں کا پیچھا کر سکتا تھا۔ کامران اِن غنڈوں کو پکڑ کر پولیس کے حوالے تو کرنا ہی چاہتا تھا لیکن وہ یہ سُراغ بھی لگانا چاہتا تھا کہ یہ لوگ کس گروہ سے تعلّق رکھتے ہیں، وُہ کون لوگ ہیں جو اِغوا کیے ہُوئے لڑکے اور لڑکیوں کو خرید کر اُن سے غیرانسانی مُشقّت لیتے ہیں اور اگر کوئی لڑکا یا لڑکی کام نہیں کرتی ہے یا وُہ فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو اُن کی ٹانگیں اور ہاتھ توڑ کر کسی بند کوٹھڑی میں مرنے کے لیے بند کر دیتے ہیں۔ کامران غنڈوں کے اِس سارے کے سارے انسان دُشمن گروہ کو قانُون کے حوالے کر کے ان کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔

اُس نے پتلون کی جیب سے پُراسرار کالا نقاب نکال کر اُسے دیکھا۔ یہ نقاب تھوڑی دیر میں اُس کے اندر زبردست طاقت پیدا کر دے گا۔ پھر وُہ اِن غنڈوں سے لڑکی کو چھُڑا کر اِن سارے غنڈوں کو پولیس کے حوالے کر دے گا۔ مگر وُہ دیر بھی نہیں لگانا چاہتا تھا۔ جیپ کی آواز اب دُور ہو رہی تھی۔ کامران آنکھوں پر نقاب لگانے ہی لگا تھا کہ اُسے اپنی امّی کی آواز سُنائی دی۔ وُہ اُچھل پڑا۔ اُس کی امّی یہاں کہاں آ گئی تھیں؟ ہو سکتا ہے اس کی تلاش میں یہاں نکل آئی ہوں۔ آواز حویلی کی سُرنگ ایسی گلی کی طرف سے آئی تھی۔ امّی نے اُسے آواز دی تھی:

"کامران بیٹا!"

کامران پُراسرار نقاب آنکھوں پر لگانا بھُول گیا اور اُسے پتلون کی جیب میں رکھ کر جلدی سے ڈیوڑھی کی گلی کی طرف بڑھا۔

"امّی جان! میں آ رہا ہُوں" وہ حویلی کی نیم تاریک گلی میں آیا تو وہاں اُسے اپنی امّی جان کہیں بھی نظر نہ آئیں۔ اُس نے چلّا کر کہا "امّی جان! آپ کہاں ہیں؟"

امّی کی آواز بند کوٹھڑی کے اندر سے آئی "کامران بیٹا! میں یہاں ہُوں۔ مجھے یہاں سے نکالو۔ میرا دم گھُٹ رہا ہے۔"

کامران پریشان ہو گیا۔ اُس نے زور سے دھکا دے کر بند دروازے کو کھٹاک سے کھول دیا۔ جُونہی وہ کوٹھڑی کے اندر داخل ہُوا اس کے سر پر کسی بھاری شے کی چوٹ لگی اور وُہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

کوٹھڑی میں لالٹین کی بتی کسی نے اُونچی کر دی۔ روشنی میں سامنے وُہی اِنسانی ہڈیوں کا ڈھانچا کھڑا تھا جس نے بارش والی رات کو سڑک پر کامران کو اپنی ٹیوٹا کرولا کار میں لِفٹ دے کر بٹھانے کی کوشش کی تھی اور کامران نے کھڑکی کھول کر باہر چھلانگ لگا دی تھی اور جس کے بارے میں شنالینی دیوی نے کامران کو خبردار کیا تھا اور کہا تھا:

"ہڈیوں کا انسانی ڈھانچا شیطان کی طرف سے دُنیا میں بُرائیاں پھیلانے کے کام پر لگایا گیا ہے۔ وُہ تُمھارا اور ہر نیک کام کرنے والے کا دُشمن ہے۔ تُمھیں اُس سے ہوشیار رہنا ہوگا۔ کیوں کہ اُس میں اِتنی طاقت ہے کہ وہ جو چاہے شکل بدل لیتا ہے، جس کی چاہے آواز بنا کر بول لیتا ہے۔"

شیطان کے دوست اِس انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے نے اپنی شیطانی طاقت سے کام لیتے ہُوئے کامران کی امّی کی آواز نکال کر اُسے کوٹھڑی کے اندر آنے پر مجبور کر دیا تھا اور جب وہ اندر آیا تو اپنے ایک ساتھی مُردے کی مدد سے اُس کے سر پر لکڑی کا ڈنڈا مار کر اُسے بے ہوش کر دیا تھا۔

شیطانی مُردے کے ڈھانچے نے دُوسرے انسانی ڈھانچے سے بیٹھی ہُوئی مکروہ آواز میں کہا "کامران کی پتلون کی جیب میں جو کالا نقاب ہے، وُہ نکال کر مجھے دے دو۔"



دُوسرا مُردہ ڈھانچا ہڈّیوں کا پنجر تھا۔ اُس نے جُھک کر بے ہوش کامران کی جیب سے کالا نقاب نِکال کر شیطانی ڈھانچے کو دے دیا۔ مُردہ شیطانی ڈھانچے نے نقاب اپنی اُنگلیوں کی ہڈّیوں میں پکڑا۔ اُس کی کھوپڑی کی آنکھوں سے ہلکا ہلکا دُھواں نِکلنے لگا۔ پھر اُس کی کھوپڑی کا مُنھ کُھلا اور ایک مکرُوہ قہقہے کی آواز بلند ہُوئی :

"میں دیکھوں گا اب یہ کیسے دُنیا سے بُرائیوں کا خاتمہ کرتا ہے۔ اِس کی طاقت اب میرے پاس ہے۔ یہ ایک کمزور لڑکا بن گیا ہے۔ اب یہ کچھ نہیں کرسکتا۔"

اور شیطانی ڈھانچا ایک خوف ناک قہقہہ لگا کر غائب ہوگیا۔ دُوسرا اِنسانی پنجر بھی اُس کے ساتھ ہی غائب ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد کامران کو ہوش آیا تو اُس کے سر کا پچھلا حصّہ سخت درد کر رہا تھا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ اندھیری کوٹھڑی میں اکیلا زمین پر پڑا تھا۔ اب اُسے یاد آیا کہ جب وُہ اپنی اتی جان کی آواز سُن کر بے اِختیار کوٹھڑی میں داخل ہُوا تھا تو اُسے نیم اندھیرے میں سامنے دیوار کے پاس اِنسانی ہڈّیوں کا ایک پنجر دکھائی دیا تھا۔ کامران نے جلدی سے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پُراسرار نقاب اُس کی جیب میں نہیں تھا۔ اُس نے پتلون کی ساری جیبیں تلاش کیں، کوٹھڑی کے فرش پر ہاتھ پھیر کر دیکھا مگر پُراسرار نقاب اُسے کہیں نہ مِلا۔ اب ساری بات اُس کی سمجھ میں آگئی۔ اُس کا نقاب اُسی اِنسانی ہڈّیوں کے ڈھانچے نے اُڑا لیا تھا۔ کامران سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اُسے شنالینی دیوی کی بات یاد آگئی۔ اُس نے کہا تھا :

"جس اِنسانی ہڈّیوں کے ڈھانچے نے تُمھیں بارش والی رات کو اپنی گاڑی میں بٹھایا تھا وُہ شیطان کا ساتھی ہے اور تُمھارا دُشمن ہے۔ اُس سے خبردار رہنا۔"

کامران سمجھ گیا کہ اُسی شیطانی ڈھانچے نے اپنی آواز اُس کی اتی جان کی آواز بنا کر کوٹھڑی میں بُلایا تھا اور پھر اُس کے سر پر کسی شے کی ضرب لگا کر اُسے بے ہوش کر کے پُراسرار نقاب اُڑا لیا تھا۔ اُسے یہ بھی یاد آگیا کہ شنالینی دیوی نے کہا تھا کہ یہ شیطانی ڈھانچا ہر شکل بدل لیتا ہے اور جس کی چاہے آواز نِکال سکتا ہے۔ کامران اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس کا سر ابھی تک چکرا رہا تھا۔ مگر یہ آرام کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ایک طرف شیطانی ڈھانچا اُس کا پُراسرار نقاب لے گیا تھا اور دُوسری طرف غنڈے معصوم لڑکی کو اغوا کر کے رحیم یار خاں والے پُرانے کنُوئیں کی طرف جا رہے تھے۔ مگر کامران بغیر نقاب کی طاقت کے اِن غنڈوں کا مُقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ پُرانی حویلی سے نِکل کر سیدھا قبرستان والی بارہ دری میں آگیا۔ یہاں اُسے شاطُور کی آواز آئی تھی اور اُس نے قبر میں چھلانگ لگائی تھی۔ بارہ دری کے اندر قبر اُسی طرح تھی۔ کامران شاطُور کی مدد سے اپنا پُراسرار نقاب واپس حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے شاطور کو آواز دی :

"شاطُور! میرے ساتھ دھوکا ہُوا ہے۔ شیطانی ڈھانچا میرا پُراسرار نقاب، میری طاقت کا راز اُڑا کر لے گیا ہے۔ میری مدد کرو۔"

دُوسرے لمحے قبر کے اندر سے شاطُور کی آواز آئی :

"تُم نے سخت غلطی کی۔ اب نہ میں تُمھاری مدد کرسکتا ہُوں اور نہ شنالینی دیوی ہی تُمھاری کوئی مدد کرسکتی ہے۔ تُم یہاں سے چلے جاؤ اور خود ہی نقاب تلاش کرو۔"

کامران نے کہا "شاطُور! میں تُم سے درخواست کرتا ہُوں کہ میری مدد کرو۔ میں دولت حاصل کرنے کے لیے، کوٹھیاں اور کاریں خریدنے کے لیے پُراسرار نقاب واپس نہیں لینا چاہتا بلکہ میں اِنسانیت کی خدمت اور دُنیا سے بُرائیوں کا خاتمہ کرنے کے لیے اور اپنے پیارے وطن کو جرائم پیشہ لوگوں سے پاک کرنے کے لیے یہ نقاب واپس لینا چاہتا ہُوں۔"

شاطُور کی آواز آئی "تو پھر ایک کام کرو۔ یہاں سے بائیں جانب سڑک کے پار ایک کلومیٹر دُور راجا اشوک کے تالاب کے پاس ایک پُرانا تالاب ہے۔ اُس کے کنارے ایک شمشان بنا ہُوا ہے جہاں کسی زمانے میں ہندو سکھ لوگ اپنے مُردوں کو چِتا پر لٹا کر جلایا کرتے تھے۔ اِس شمشان میں آج سے سو سال پہلے ایک ہندُو عورت کو اُس کے دُشمن رشتے داروں نے جائیداد کے لالچ میں بے ہوش کر کے زندہ ہی جلا دیا تھا۔ آدھی رات کو آج بھی اُس ہندو عورت کی بدرُوح اس شمشان میں آتی ہے۔ اُس کے بال کُھلے ہوتے ہیں۔ وُہ حلق سے خوف ناک آوازیں نکال کر بَین کرتی ہے۔ کوئی سامنے آجائے تو دہشت سے اُس کے دِل کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔ اگر تُم نے اِس بدرُوح پر قابُو پا لیا تو صرف وُہی تُمھیں بتا سکتی ہے کہ تُمھارا پُراسرار نقاب کہاں ہے۔ اب جاؤ۔ مُجھے دوبارہ آواز نہ دینا۔ میں جا رہا ہُوں۔"

بارہ دری میں سنّاٹا چھا گیا۔ بارش رُک گئی تھی لیکن آسمان پر بادل اُسی طرح چھائے ہُوئے تھے۔ کامران نے سوچا کہ اب گھر چلنا چاہیے۔ پھر آدھی رات کو ہندُو عورت کی بدرُوح سے مِل کر اُسے قابُو میں کرنے کی کوشش کروں گا۔ وُہ سر جُھکائے آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

جب ہندُو عورت کی بدرُوح آدھی رات کو آئی تو کیا ہُوا؟
یہ جاننے کے لیے "تعلیم و تربیت" کا اکتوبر کا شمارہ ضرور پڑھیے۔

اچھّے بچّو

ناصر زیدی

اچھّے بچّو ، پیارے بچّو
میرے چاند ستارے ، بچّو
جگ کی آنکھ کے تُم ہو تارے
سب کو جان و دِل سے پیارے
تُم سے قائم شان وطن کی
آن وطن کی، جان وطن کی
تُم سے روشن یہ گہوارہ
آنے والا کل ہے ، تمُھارا
کل جو کُچھ ہو تُم کو حاصل
اوروں کو بھی کرنا شامل
مُشکِل میں تُم مت گھبرانا
کام میں اپنے جی کو لگانا
اُلفت کا پیغام سُنا کر
خوشیوں کے تُم نغمے گا کر
ہردم آگے بڑھتے جانا
سچّائی کو تُم اپنانا

مِل جُل کر تُم رہنا بچّو
سب کے دُکھ سُکھ سہنا بچّو





پیراشوٹ

پرواز کے دوران ہوائی جہاز میں خرابی پیدا ہو جاتے اور اُس کے تباہ ہونے کا خطرہ ہو تو ہوا باز پیراشوٹ (ہوائی چھتری) کے ذریعے زمین پر اُتر آتا ہے، اور اِس طرح اُس کی جان بچ جاتی ہے۔ فضائی فوج کا کوئی ہوا باز پیراشوٹ کے بغیر ہوائی جہاز میں سوار نہیں ہوتا، البتہ مُسافر ہوائی جہازوں کے ہوا بازوں کے لیے پیراشوٹ اِستعمال کرنا منع ہے۔

کہتے ہیں سب سے پہلا پیراشوٹ اِٹلی کے مشہور سائنس دان لیونارڈو دا وِنشی نے آج سے تقریبًا 500 سال قبل بنایا تھا۔ لیکن یہ ایک اِبتدائی کوشش تھی، بھونڈی اور بھدی۔ اِس کے بعد بہت سے لوگوں نے اِس میں اصلاحیں کیں اور نئے ڈیزائنوں کے پیراشوٹ بنائے۔

1783ء میں ایک فرانسیسی ڈاکٹر، سباستین لنارماں، نے لکڑی کے ڈھانچے پر کپڑا منڈھ کر پیراشوٹ بنایا اور اس کے ذریعے اُونچی عمارت سے چھلانگ لگا کر لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا۔

1797ء میں ایک اور فرانسیسی، آندرے گارنیرن نے، ہوا میں اُڑتے ہُوئے غبارے پر سے، پیراشوٹ کے ذریعے، چھلانگ لگانے کا مُظاہرہ کیا۔ اِس کا یہ کارنامہ پیرس کے ہزاروں لوگوں نے دیکھا۔ جب گارنیرن کا غبارہ 3,000 فٹ کی بلندی پر پہنچا تو اُس نے وہ رسّی کاٹ دی جس سے پیراشوٹ غبارے کے ساتھ بندھا ہُوا تھا۔ رسّی کے کٹتے ہی پیراشوٹ تیزی سے زمین کی طرف آیا۔ یہ خوف ناک منظر دیکھ کر بہت سی عورتیں اور کم زور دل لوگ بے ہوش ہو گئے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ گارنیرن کا پیراشوٹ دھڑام سے زمین پر آ گرے گا، اور اُس کی ہڈّی پسلی ایک ہو جائے گی۔ مگر جب [illegible] ہو بھری تو اُس کی رفتار سُست ہو گئی اور وہ ہولے ہولے [illegible] پیراشوٹ آج کل کے پیراشوٹوں کے مُقابلے میں بہت [illegible] لکڑی کے ڈھانچے پر کین وَس منڈھ کر بنایا گیا تھا۔

اب تک جو پیراشوٹ بنائے گئے تھے [illegible] خرابی تھی کہ ان میں لٹکا ہُوا آدمی پتنگ کی طرح ڈولتا تھا۔ [illegible] تھی۔ آخر ایک انگریز، رابرٹ کاکِنگ نے اِس خرابی کو [illegible] اُس نے طشتری کی شکل کا پیراشوٹ بنایا اور اُس کے نیچے [illegible]۔


ڈاکٹر سباستین کا پیراشوٹ
(1783ء)

24 جولائی 1837ء کو رابرٹ کاکنگ نے لندن کے واکس ہال گارڈن میں اس پیراشوٹ کی اُڑان کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے پیراشوٹ ایک غبارے کے نیچے باندھا اور غبارے کو گیس کے ذریعے ہوا میں اُڑا دیا۔ وہ خود پیراشوٹ کی ٹوکری میں کھڑا ہُوا تھا۔ لوگ خُوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔ 5000 فٹ کی بلندی پر پہنچ کر اُس نے پیراشُوٹ کو غبارے سے الگ کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے پیراشُوٹ کا لکڑی کا ڈھانچا، ہوا کے دباؤ سے، ٹوٹ گیا اور رابرٹ زمین پر گر کر مر گیا۔

اِنسان عزم اور عمل کا پُتلا ہے۔ وُہ ناکامی سے مایُوس نہیں ہوتا، اُس سے سبق سیکھتا ہے۔ اِس حادثے کے 15 مہینے بعد ایک اور انگریز، جان ہیمپٹن، نے ایک ہلکا پُھلکا پیراشُوٹ بنایا اور اُس کے ذریعے اُڑتے ہُوئے غبارے سے کامیابی کے ساتھ زمین پر اُتر آیا۔

اِس کے بعد اور بہت سے لوگوں نے پیراشُوٹ بنائے اور اُن کی خرابیاں دُور کرنے کی کوشش کی۔ اِن میں سب سے اچھا اور سب سے ہلکا پیراشُوٹ ہالینڈ کے ایک شخص، فان ٹاسل، کا تھا۔ اب تک لکڑی کے ڈھانچے پر کپڑا منڈھ کر پیراشُوٹ بنائے جاتے تھے۔ فان ٹاسل نے سُوتی کپڑے کی ایک چھتری بنائی جس میں مضبُوط ڈوریاں بندھی ہُوئی تھیں۔ فان ٹاسل کا یہ پیراشُوٹ بہت مقبول ہُوا۔ کُچھ عرصے بعد سُوتی کپڑے کے بجائے ریشمی کپڑے کے پیراشُوٹ بنائے جانے لگے، جس سے یہ اور زیادہ ہلکے اور مضبُوط ہو گئے۔

امریکا کا ایک فوجی، کیپٹن البرٹ بیری، پہلا شخص تھا جس نے پیراشُوٹ کے ذریعے ہوائی جہاز سے چھلانگ لگائی۔ اُس کا جہاز 55 میل فی گھنٹے کی رفتار سے اُڑ رہا تھا۔ یہ واقعہ 1912ء کا ہے۔ اُن دِنوں ہوائی جہاز نیا نیا ایجاد ہُوا تھا اور اُس کی رفتار بہت کم تھی۔

لیکن پیراشُوٹ کے ذریعے زمین پر اُترنا ابھی تک ایک کھیل ہی سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اِس سے ہوابازوں کی جانیں بھی بچائی جا سکتی ہیں۔ 1914ء میں پہلی جنگِ عظیم شرُوع ہُوئی تو اُس میں دشمن کے جنگی ٹھکانوں پر بم باری کے لیے ہوائی جہاز بھی اِستعمال ہُوئے۔ مگر ہوابازوں کو پیراشُوٹ نہیں دیے گئے۔ اگر وُہ پیراشُوٹ اِستعمال کرتے تو 50 فی صد کی جانیں بچ جاتیں۔ جنگ کے آخری دِنوں میں جرمن ہوابازوں نے کہیں کہیں پیراشُوٹ اِستعمال کیے تھے۔

پہلی جنگِ عظیم کے 21 سال بعد دُوسری جنگِ عظیم ہُوئی جو ستمبر 1939ء سے ستمبر 1945ء تک جاری رہی۔ اس میں ہوابازوں نے پیراشُوٹ اِستعمال کیے اور اِس طرح ہزاروں ہوا باز موت کے مُنھ میں جانے سے بچ گئے۔

اب پیراشوٹ نائلون کے بنائے جاتے ہیں۔ یہ بہت ہلکے پُھلکے اور مضبُوط ہوتے ہیں اور ان سے کئی کام لیے جاتے ہیں۔ جنگ کے دوران، پیراشوٹوں کے ذریعے، دُشمن کے علاقے میں فوج اُتاری جاتی ہے۔ اِسے چھاتا فوج کہتے ہیں۔ اِس کے عِلاوہ، ضرُورت کے وقت، گولا بارُود اور کھانے پینے کا سامان، بھی پیراشوٹوں سے فوج کے مورچوں میں گرایا جاتا ہے۔

تیز رفتار ہوائی جہازوں کو ہوائی اڈّے پر روکنے کے لیے بھی پیراشوٹ اِستعمال کیے جاتے ہیں۔ جب اس قسم کا ہوائی جہاز زمین پر اُترتا ہے تو جہاز کے پیچھے بندھا ہُوا پیراشُوٹ کُھل جاتا ہے اور اُس میں ہوا بھرتی ہے تو ہوائی جہاز کی رفتار کم ہو جاتی ہے اور اُسے بریک لگا کر روک لیا جاتا ہے۔ خلاباز جس کیپسُول میں بیٹھ کر زمین پر اُترتے ہیں، اُس میں پیراشوٹ لگا ہوتا ہے۔ پیراشوٹ نہ ہو تو کیپسُول خُشکی یا پانی پر گر کر پاش پاش ہو جائے۔ (س۔ل)



لال سویٹر

اجمل وجیہ

میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا جا رہا تھا، کیوں کہ سکول کو دیر ہو رہی تھی۔ جب میں چچا رحیمو کے مکان کے پاس پہنچا تو چچا کھڑکی میں کھڑے نظر آئے۔ حسبِ معمول انھوں نے مجھے دیکھتے ہی آواز دی "سنو بیٹا!"

میں کھڑکی کے پاس رُک گیا "کیا بات ہے، چچا؟"

"بیٹے، چھٹی کے بعد میرے گھر آنا۔ ایک ضروری کام ہے" چچا رحیمو نے کہا۔

"بہت اچھا، چچا" کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔

چھٹی کے بعد تقریباً اڑھائی بجے کے قریب جب میں چچا رحیمو کے مکان کے پاس پہنچا تو مجھے سخت حیرت ہُوئی۔ چچا کھڑکی میں کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں فوراً مکان کے اندر داخل ہو گیا۔

"ہاں چچا، کیا بات ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"بیٹا، مجھے معلوم ہے تم بہت تھکے ہُوئے ہو" چچا نے کہا "لیکن کیا کروں بیٹا۔ اِن جُوتوں سے تو میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔"

میں نے چچا رحیمو کے جُوتے دیکھے جو جگہ جگہ سے پھٹے ہُوئے تھے۔ چچا ننگے پاؤں کھڑے تھے۔

"سپر سٹور سے خریدے تھے" تھوڑی سی خاموشی کے بعد چچا رحیمو بولے "اُنھی کے پاس لے جاؤ۔ وہ کم پیسوں میں مرمّت کر دیں گے۔"

سپر سٹور شہر میں تھا اور ہمارے گاؤں سے شہر تک کا فاصلہ کم از کم تین کلو میٹر تھا۔ چھ گھنٹے سکول میں پڑھنے کے بعد میرا آرام کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ چچا رحیمو نے فوراً میرے چہرے سے میرے دل کی حالت پڑھ لی۔ وہ اُداس سے لہجے میں بولے:

"میرا ابھی جی نہیں چاہ رہا کہ اِس وقت تمھیں شہر بھیجوں۔ لیکن بیٹے، میرے پاس اِن کے سوا اور کوئی جُوتے نہیں ہیں۔ جب تک اِن کی مرمت نہیں ہو جاتی، مجھے ننگے پاؤں پھرنا پڑے گا۔" یہ کہتے کہتے چچا رحیمو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ مجھے اُن پر بڑا ترس آیا۔

"نہیں نہیں، چچا۔ ایسی کوئی بات نہیں" میں نے جلدی سے کہا "تمھارا کام کرنا تو ثواب کا کام ہے۔"

"شاباش! میرے بیٹے، شاباش!" چچا رحیمو نے خوش ہو کر کہا اور جُوتے اخبار کے کاغذ میں لپیٹ کر مجھے دے دیے۔

میں جانے لگا تو انھوں نے کہا "ذرا ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں"۔ وہ ننگے پاؤں دُوسرے کمرے میں چلے گئے۔

میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مجھے ڈبو کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ حالانکہ اِس سے پہلے جُوں ہی چچا رحیمو کے گھر میں داخل ہوتا، میرے پیروں میں لوٹنے لگتا۔ چچا رحیمو کے پاس یہی ایک پلّا تھا جس سے وہ اپنا دل بہلاتے تھے۔

چچا کا مکان ہمارے گھر سے تھوڑے سے فاصلے پر تھا۔ وہ برسوں سے اِس مکان میں اکیلے رہ رہے تھے۔ مکان بہت پرانا تھا اور شاید چچا رحیمو کے دادا نے بنوایا تھا۔ اب وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ رنگ و روغن بھی اُتر چکا تھا اور ذرا سی ہوا چلنے سے دروازے کھٹ کھٹ بجتے تھے۔

میں نے اپنی امّی سے سُنا تھا کہ چچا رحیمو کے تین جوان بیٹے ہیں اور شہر میں مُلازم ہیں۔ لیکن آج تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ چچا رحیمو اِس کباڑ خانے میں اکیلے کیوں رہتے ہیں!

ایک دِن میں نے امّی سے پُوچھا تو اُنھوں نے بتایا "دراصل انھیں اپنے اِس گھر سے بہُت پیار ہے۔ اِس لیے وہ اِسے چھوڑ کر بیٹوں کے پاس نہیں جانا چاہتے۔"

"لیکن امّی، اِس مکان میں رکھا ہی کیا ہے؟ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہُوئے ہیں، دیواروں میں شِگاف پڑے ہُوئے ہیں۔ ذرا سی ہوا چلتی ہے تو دروازے ٹھک ٹھک بولتے ہیں۔"

امّی نے مُسکرا کر میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بولیں "تم ابھی بچّے ہو۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔ جس گھر میں زندگی گُزاری ہو، اُس کی دیواریں کتنی ہی بوسیدہ کیوں نہ ہوں اور دروازے کیسے ہی خراب کیوں نہ ہوں، انسان کو اُن سے بڑی محبّت ہوتی ہے۔ وُہ پُرانی چھتوں کے نیچے نئے نئے خواب دیکھتا ہے جس سے دل کو راحت ملتی ہے۔ ایسی راحت جو نئے بنگلے میں حاصِل نہیں ہو سکتی۔" امّی کی باتیں اُس وقت بھی میری سمجھ میں نہ آئیں اور آج بھی نہیں سمجھ پایا۔

اچانک ڈبُّو کے بھونکنے کی آواز آئی۔ میں تیزی سے باہر دوڑا۔ گلی میں ایک کار کھڑی تھی جس میں ایک آدمی اور ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ لڑکا جُوں ہی کار کا دروازہ کھول کر پاؤں زمین پر رکھتا، ڈبُّو غُرّانے لگتا۔

میں نے ڈبُّو کو آواز دی۔ وہ فوراً میرے پاس آگیا اور میرے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ لڑکے نے مجُھے دیکھ کر ہمّت کی اور کار سے باہر نکل آیا۔

"دیکھو بھائی، مجُھے سخت پیاس لگی ہے۔ ایک گلاس پانی لا دو۔" لڑکے نے کہا۔

میں نے ڈبُّو سے کہا "یہ مہمان ہیں۔ غُرّانا مت۔" اور پانی لینے کے لیے چچا رحیمو کے گھر چلا گیا۔

جب میں پانی کا گلاس لے کر آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ڈبُّو لڑکے کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ میں نے پانی کا گلاس لڑکے کو دیا۔ اُسے شاید زیادہ پیاس لگی تھی۔ ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا۔

"اور لاؤں؟" میں نے کہا۔

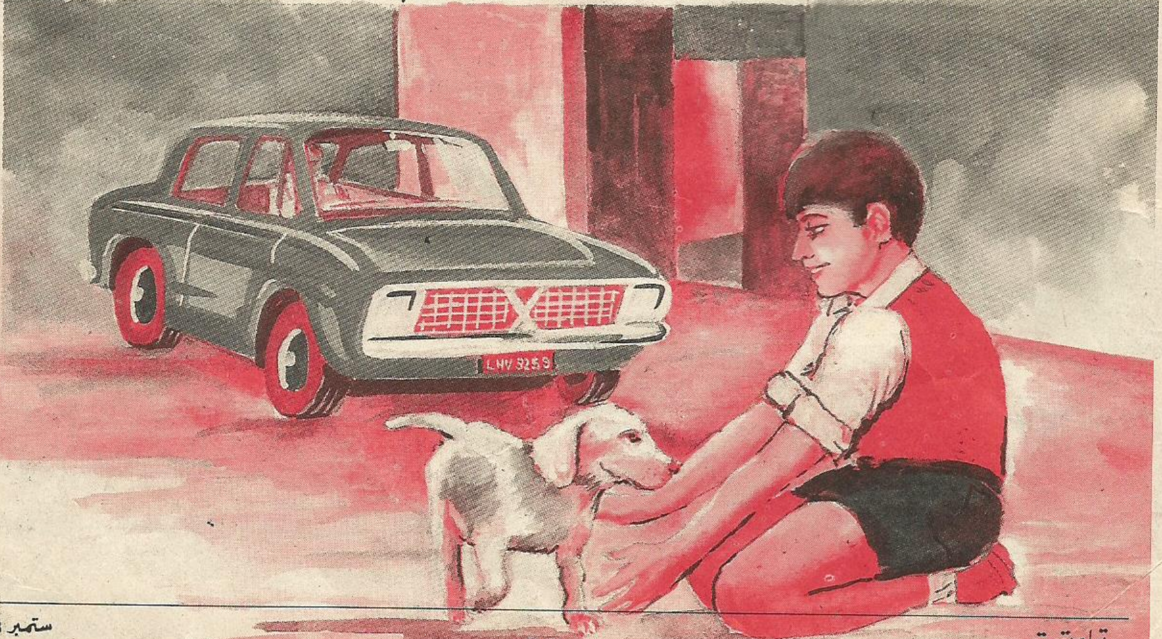
"نہیں شکریہ" لڑکے نے جواب دیا اور ڈبُّو کو پیار کرنے لگا۔

میں نے لڑکے کو غور سے دیکھا۔ وہ تقریباً میرا ہم عُمر تھا۔ یہی چودہ پندرہ برس کا۔ قد اور جسم کے لحاظ سے بھی مجُھ سے مِلتا جُلتا تھا۔ اُس نے سفید پتلون اور لال رنگ کا سویٹر پہنا ہُوا تھا، جس پر ایک بارہ سِنگے کی نیلے رنگ کی تصویر بنی ہُوئی تھی۔ مجُھے اُس کا سویٹر بہُت پسند آیا۔ میں نے دل میں کہا "کاش! ایسا سویٹر میرے پاس بھی ہوتا۔" پھر میں نے لڑکے سے پُوچھا "کہاں سے لیا ہے تُم نے یہ سویٹر؟ بڑا خُوب صُورت ہے۔"

"شکریہ" لڑکے نے جواب دیا "میرے ابّا جان نیو سُپر سٹور سے لائے تھے۔ دو سو کا ہے" پھر اُس نے پِلّے کو پیار کرتے ہُوئے کہا "تم پِلّا بیچو گے؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا "یہ پِلّا چچا رحیمو کا ہے۔ وہ اِسے ہرگز نہیں بیچیں گے کیوں کہ یہی اُن کا ایک ساتھی ہے۔" لڑکے نے پِلّے کو ایک بار پھر پیار کیا اور باپ کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔

میں دیر تک کار کو دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو مُڑا اور سامنے چچا رحیمو کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُنھوں نے مجُھے دس رُوپے



کا نوٹ دیتے ہُوئے کہا "میرے پاس صرف دس رُوپے ہیں۔ اگر ان پیسوں میں جُوتے ٹھیک ہو جائیں تو ٹھیک، ورنہ واپس لے آنا۔"

چچا رحیمُو سے دس رُوپے اور جُوتے لے کر میں سیدھا اپنے گھر گیا۔ مجھے امّی جو جیب خرچ دیتی تھیں، میں اس میں سے ایک دو رُوپے بچا لیتا تھا، اور اُس وقت میرے پاس سو رُوپے جمع ہو چکے تھے۔ میں امّی کے پاس گیا، انھیں لڑکے اور اُس کے لال سویٹر کے مُتعلق بتایا اور ایک سو روپے کی فرمائش کی۔ پہلے تو امّی نے انکار کیا، پھر مان گئیں اور مجھے ایک سو روپے دے دیے۔ میں نے بڑے بھائی کی سائیکل لی اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب میں شہر پہنچا تو سب سے پہلے نیو سُپر سٹور سے لال سویٹر خریدا۔ پھر سُپر سٹور گیا اور سٹور کے مالک کو چچا رحیمُو کے جُوتے مرمّت کرنے کے لیے دیے۔

"اِن کی اور مرمّت نہیں ہو سکتی" سٹور کے مالک نے کہا اور جُوتے مجھے واپس دے دیے۔

میں سوچنے لگا کہ کیا کروں! میری آنکھوں کے سامنے چچا رحیمُو کی مسکین سی صورت گھُومنے لگی۔ پھر اُن کی آواز سُنائی دی "جب تک اِن جُوتوں کی مرمّت نہ ہو گی، مجھے ننگے پاؤں پھرنا پڑے گا۔"

میں کچھ دیر سٹور کے باہر کھڑا سوچتا رہا۔ پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ سیدھا نیو سُپر سٹور گیا اور سویٹر واپس کرتے ہُوئے سٹور کے مالک سے کہا "مہربانی فرما کر یہ سویٹر واپس لے لیجیے اور اس کے بدلے میں اس سائز کے جُوتے دے دیجیے۔"

یہ کہ کر میں نے چچا رحیمُو کے پُرانے جُوتے سٹور کے مالک کی طرف بڑھائے اور اُسے چچا رحیمُو کے مُتعلق سب کچھ بتا دیا۔

سٹور کے مالک نے سویٹر لے لیا اور اُس کے بدلے میں جُوتے دے دیے۔ میں نے جُوتے ڈبّے میں سے نکال کر اخبار کے کاغذ میں لپیٹ لیے اور گاؤں کی طرف چل پڑا۔

میں بہت خوش تھا۔ شاید لال سویٹر پہن کر مجھے اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی چچا رحیمُو کے لیے نئے جُوتے خرید کر ہُوئی تھی۔ میری امّی سچ کہتی تھیں کہ حقیقی خُوشی کسی کی مدد کرنے سے ہوتی ہے۔

جب میں چچا رحیمُو کے گھر پُہنچا تو وہ چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ میں نے آہستہ سے کہا "سٹور کے مالک نے جُوتوں کی مرمّت کرنے سے اِنکار کر دیا ہے۔ اُس نے کہا کہ جُوتوں کی مزید مرمّت نہیں ہو سکتی۔"

چچا رحیمُو کا چہرہ ایک دم مُرجھا گیا "کوئی بات نہیں۔ اگلے مہینے میں نئے خرید لُوں گا۔"

میں نے اخبار میں لپٹے ہُوئے جُوتے اُنھیں دے دیے۔ اُنھوں نے کاغذ کھولا اور نئے جُوتے دیکھے تو آنکھوں میں آنسُو بھر آئے۔

"اچھّا، چچا۔ اب میں چلتا ہُوں۔" مجھے اُن کا سامنا کرنا مُشکل ہو رہا تھا۔

"ٹھہرو" اُنھوں نے پیار سے کہا اور تکیے کے نیچے سے اخبار میں لپٹا ہُوا ایک پیکٹ نکال کر مجھے دیا۔

"یہ کیا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"کھول کر دیکھ لو۔"

کاغذ کھولا تو میری حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ میرے ہاتھوں میں لال سویٹر تھا۔ وُہی لال سویٹر جو تھوڑی دیر پہلے اُس لڑکے نے پہنا ہُوا تھا یا میں نے نیو سُپر سٹور کے مالک کو واپس کیا تھا۔

"جب کار والا لڑکا یہاں آیا تھا تو میں نے محسُوس کیا تھا کہ تمھیں اُس کا سویٹر بہُت پسند ہے۔ تمھارے جانے کے بعد وہ لوگ جب اِدھر سے گزرے تو میں نے ڈبّہ دے کر لڑکے سے تمھارے لیے سویٹر لے لیا۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں! کس طرح چچا رحیمو کا شکریہ ادا کروں! چچا نے فوراً نئے جُوتے پہنے اور خوشی سے کہا "اب تم گھر جاؤ، بہُت تھکے ہُوئے ہو۔ میں نے تمھیں سکول سے آتے ہی شہر بھیج دیا تھا۔ تمھاری امّی اِنتظار کر رہی ہوں گی۔"

میں نے چچا رحیمو کے سامنے لال سویٹر پہنا اور گھر کی طرف بھاگ گیا۔



آئیے، مُسکرائیں

شاکر: ہمارے باپ دادا محمدؐ بن قاسم کے ساتھ عرب سے آئے تھے۔

ذاکر: اب کل کلاں کو تم کہو گے کہ تمہارے باپ دادا حضرت نوحؑ کی کشتی میں سوار تھے۔

شاکر: ہرگز نہیں۔ اُن کی اپنی کشتی تھی۔ (عبدالحمید گوجرانوالہ)

باپ: بیٹے، آپ کی مس نے مجھے بتایا کہ آپ تاریخ میں بالکل صفر ہیں

بیٹا: کیا کروں، ابو۔ وہ اُن لوگوں کے بارے میں پُوچھتی ہیں جو میرے پیدا ہونے سے بہت پہلے مرگئے تھے (احمد سعید۔ لاہور)

مریض: ڈاکٹر صاحب، میری گردن لوہے کے پائپ کی طرح سخت ہو گئی ہے۔ سر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اُس میں سیسہ بھرا ہوا ہے اور ناک تو بالکل بند ہے۔

ڈاکٹر: آپ کسی نلکے والے کے پاس جائیے (عبدالحفیظ رانا۔ ساہیوال)

دو پہلوان، اکھاڑے میں، کُشتی لڑ رہے تھے۔ مُقابلہ بہت سخت تھا۔ اچانک ریفری نے ایک پہلوان سے چلّا کر کہا "یہ ٹانگ مت مروڑو، بے وقوف!"

"نہیں میں اِسے توڑ کر ہی دم لُوں گا" پہلوان نے غُصّے سے کہا۔

"لیکن یہ تو تُمھاری اپنی ٹانگ ہے۔" (بُشریٰ نذیر۔ لاہور)

ماسٹر صاحب: نسیم، بتاؤ، 1876ء میں کون سا اہم واقعہ ہوا تھا؟

نسیم: سر، قائدِ اعظمؒ پیدا ہوئے تھے۔

ماسٹر صاحب: شاباش! اچھا سلیم، اب تُم بتاؤ 1879ء میں کیا اہم واقعہ ہوا تھا؟

نسیم: سر، قائدِ اعظمؒ کی تیسری سالگرہ ہُوئی تھی (صالحہ ادیب حیدرآباد)

رفیق: مُجھے دو سو رُوپے اُدھار دے دیجیے۔

شفیق: ذرا اُونچا بولیے۔ سنائی نہیں دے رہا۔

رفیق: (زور سے) دو سو روپے اُدھار دے دیجیے۔

شفیق: کچھ سُنائی نہیں دیا (حمید سے) آپ کو سنائی دے رہا ہے؟

حمید: جی ہاں۔

شفیق: تو پھر آپ دیجیے۔ (ذیشان احمد خان۔ لاہور)

میزبان (گیٹ کھول کر): آئیے، آئیے تشریف لائیے۔

مہمان: یہ۔ آپ کا کُتا بھونک رہا ہے۔

میزبان: یہ دُم بھی تو ہلا رہا ہے

مہمان: مگر میں اس کے مُنہ کا یقین کروں یا دُم کا؟ (سعید خان۔ راولپنڈی)

گاہک: کل میں نے آپ کی دکان سے ہاتھی دانت کی کچھ چیزیں خریدی تھیں۔ دیکھیے، یہ تو پلاسٹک کی ہیں۔

دکاندار: دراصل بات یہ ہے جناب، ہاتھی نے مصنوعی دانت لگوایا تھا۔

(سید اویس احمد۔ کراچی)

گاہک: (بیرے سے): ایک پلیٹ گوشت لاؤ، جو اتنا سخت ہو جتنا پرانے جُوتے کا چمڑا۔ ایک پلیٹ مٹر لاؤ، جو اتنے سخت ہوں جتنی بندوق کی گولی۔ ایک پلیٹ دہی لاؤ، جس میں سے مرے ہُوئے چُوہے کی سڑاند آ رہی ہو۔

بیرا: افسوس ہے سر! ہم آپ کو ایسی چیزیں پیش نہیں کر سکتے۔

گاہک: (میز پر مُکا مار کر): کیوں نہیں کر سکتے؟ کل تم نے ایسی ہی چیزیں مجھے کھلائی تھیں۔ (محمد انور۔ لالہ مُوسیٰ)

پولیس کا سپاہی: مجھے ایسے آدمی کی تلاش ہے جس کی صرف ایک ٹانگ ہے اور اس کا نام شرفُو ہے۔

ایک شخص: اور اس کی دوسری ٹانگ کا نام کیا ہے؟ (مقبول رشید حیدرآباد)

"شکر ہے میں فرانس میں پیدا نہیں ہُوا۔"

"کیوں؟"

"میں فرانسیسی نہیں بول سکتا۔" (اویس ہارُون۔ لاہور)



بیرُونی چیزوں کا جسم میں داخل ہونا

بیرُونی یعنی باہر کی چیزوں سے مُراد وہ ننھی ننھی کنکریاں، لکڑی کے ریشے یا شیشے اور دھات کی کرچیں ہیں جو جلد میں شگاف کر کے، یا ناک، کان اور مُنھ کے راستے جسم میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اِن چیزوں کو باہر نکالنے کیلئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔



1۔ اگر کسی کے ہاتھ یا جسم کے کسی اور حصّے میں پھانس چُبھ جائے اور اس کا سرا باہر نکلا ہُوا ہو تو جراثیم سے پاک چمٹی سے پکڑ کر نکال دیجیے۔ سرا نظر نہ آ رہا ہو اور پھانس جلد کے کافی اندر ہو تو کسی ڈاکٹر یا تجربہ کار نرس سے نکلوائیے۔ خود، سُوئی سے جلد کو چھید کر، نکالنے کی کوشش نہ کیجیے۔ یہ خطرناک ہے۔

اگر پھانس کا سرا دکھائی دے رہا ہو تو پہلے اُس جگہ کو صابن اور پانی سے صاف کیجیے۔ رگڑیے نہیں۔ اِس کے بعد چمٹی کو آگ پر تپائیے تاکہ وہ جراثیم سے پاک ہو جائے (چُولھے کے علاوہ ماچس یا لائٹر سے بھی یہ کام لیا جا سکتا ہے)۔ چمٹی کو ٹھنڈا ہونے دیجیے۔ اُس کے سرے پر سے کالک صاف نہ کیجیے۔ اب پھانس کا اُبھرا ہُوا سرا چمٹی سے پکڑ کر کھینچ لیجیے۔ اگر پھانس ٹوٹ جائے اور اُس کا کچھ حصّہ جلد کے اندر رہ جائے تو بچّے کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیے۔ خُود نکالنے کی کوشش نہ کیجیے۔

2۔ بعض وقت آنکھ میں کوئی کنکری یا گرد وغیرہ چلی جاتی ہے۔ پلکوں کا کوئی بال بھی ٹوٹ کر آنکھ میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں آنکھ کو مَلنا نہیں چاہیے۔ اِس سے آنکھ کے زخمی ہونے کا امکان ہے۔ اُس شخص کو کُرسی پر، روشنی کی طرف مُنھ کر کے، بٹھا دیجیے۔ اب صابن سے اپنے ہاتھ دھوئیے اور اُس شخص سے کہیے کہ اُوپر کی طرف دیکھے۔ آپ اُس کے پیچھے کھڑے ہوں۔ ایک ہاتھ اُس کے سر پر رکھیں اور دُوسرے ہاتھ سے اُس کی ٹھوڑی کو سہارا دے کر، انگوٹھے سے اُس کے نچلے پپوٹے کو نیچے کی طرف کھینچیں۔ اگر پپوٹے کے اندر یا آنکھ کی سفیدی پر کوئی چیز نظر آئے تو اُسے صاف پانی میں بھیگی ہُوئی رُوئی یا دُھلے ہُوئے رُومال یا پیپر ٹشو سے باہر نکال لیجیے۔

اگر وہ چیز اُوپر کے پپوٹے میں ہو تو اُس شخص سے کہیے، نیچے دیکھے۔ پھر اُوپر کا پپوٹا اُنگلیوں سے پکڑ کر نیچے کی طرف آہستہ کھینچیے کہ وہ نچلے پپوٹے پر آجائے۔ اِس کے بعد چھوڑ دیجیے۔ اگر اس ترکیب سے وہ چیز نہ نکلے تو کسی بڑے پیالے میں صاف پانی بھریے۔ اب اُس شخص سے کہیے کہ اُس میں آنکھ ڈبو کر بار بار کھولے اور بند کرے۔ وہ چیز آنکھ سے نکل کر پانی میں آجائے گی۔ اِس طریقے سے بھی آنکھ صاف نہ ہو تو پھر اُس شخص کو ڈاکٹر کی مدد کی ضرورت ہوگی۔

3۔ اگر کسی شخص کے کان میں کیڑا گھس جائے تو اُسے کروٹ کے بل لِٹا دیجیے۔ پھر اُس کے کان میں نیم گرم پانی ڈال دیجیے۔ کیڑا اُوپر آجائے گا۔ کسی بچّے نے کوئی ٹھوس چیز کان میں ڈال لی ہو تو اُس کا سر کندھے کی طرف، جُھکا کر، ہلائیے، وہ چیز باہر آجائے گی۔ اگر آپ چیز یا کیڑے وغیرہ کو کان میں سے نہ نکال سکیں تو پھر فوراً ڈاکٹر کی مدد حاصل کیجیے۔

4۔ بعض وقت بچّے ناک میں کوئی چیز داخل کر لیتے ہیں۔ اس صورت میں بچّے سے کہیے کہ وہ مُنھ سے سانس لے۔ پھر جتنی جلد ممکن ہو سکے ہسپتال لے جائیے۔

(س-ل)

کھیل تماشے

نہ۔ہاں

تین تین، چار چار لڑکوں یا لڑکیوں کی دو دو ٹیمیں بنالیں پہلے ٹاس کریں جو ٹیم جیت جائے گی، وہ دوسری ٹیم سے سوال کرے گی۔ اگر جواب دینے والی ٹیم کا کوئی رکن جواب میں "ہاں" یا "نہ" (نہیں) کہے گا تو وہ آؤٹ ہوجائے گا۔

سوال کرنے والے مخالف ٹیم پر سوالوں کی بوچھاڑ کردیں، اور کوشش کریں کہ اُس کا کوئی رکن گھبرا کر ہاں یا نہ کہ دے۔

شلاً کوئی سوال کرتا ہے "کیا گھوڑے کی پانچ ٹانگیں ہوتی ہیں؟ یا کتنے گھوڑوں کی پانچ ٹانگیں ہوتی ہیں"؟ اس کے جواب میں کسی نے یہ کہا کہ "نہیں۔گھوڑے کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔یا کسی گھوڑے کی پانچ ٹانگیں نہیں ہوتیں" تو وہ آؤٹ ہوجائے گا۔ اسے جواب دینا چاہیے "گھوڑے کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں"۔ یا "سب گھوڑوں کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں"۔

یا کوئی پوچھے "کیا پاکستان 14 اگست 1947ء کو قائم ہوا تھا تو اس کا صحیح جواب ہوگا "پاکستان 14۔ اگست 1947ء کو قائم ہوا تھا" اگر کسی نے کہا کہ "ہاں" تو وہ آؤٹ ہوجائے گا (اس کھیل میں "صحیح" یا "غلط" الفاظ استعمال نہیں کیے جائیں گے)

سوال خوب سوچ سمجھ کر کریں اور کوشش کریں کہ مخالف ٹیم کے رکن گڑبڑا کر ہاں یا نہ کہ دیں۔ جس ٹیم کے تمام رکن آؤٹ ہوجائیں گے، وہ ہار جائے گی۔

نام لکھیے

اس کھیل میں جتنے بچے چاہیں، حصہ لے سکتے ہیں۔ ہر بچے کے پاس کاغذ قلم ہونا چاہیے وہ چیزوں کے نام لکھیں گے۔ کسی بڑے شخص کو ریفری بنالیں۔ اُس کے پاس گھڑی ہونی چاہیے۔ کھیل شروع کرنے سے پہلے فیصلہ کرلیں کہ کن چیزوں کے نام لکھنے ہیں۔ مثلاً ان میں سے کوئی ایک چن لیں:

جانور

پرندے

پھول

ٹیلی وژن پروگرام

اب فرض کریں آپ جانور چنتے ہیں۔ ریفری "شروع" کہ کر گھڑی پر نظریں جمائے رکھے گا، اور بچے جانوروں کے نام لکھنا شروع کردیں گے۔ جب ایک منٹ گزر جائے گا تو ریفری "بس" کہ کر انھیں روک دے گا۔ جس بچے نے سب سے زیادہ جانوروں کے نام لکھے ہوں گے، وہ جیت جائے گا۔

جانوروں کے بعد پرندوں کے اور اس کے بعد پھولوں کے، درختوں کے، ٹی وی پروگرام وغیرہ کے نام لکھے جاسکتے ہیں۔ اس طرح یہ کھیل ایک ڈیڑھ گھنٹے تک کھیلا جاسکتا ہے۔

یادداشت کا امتحان

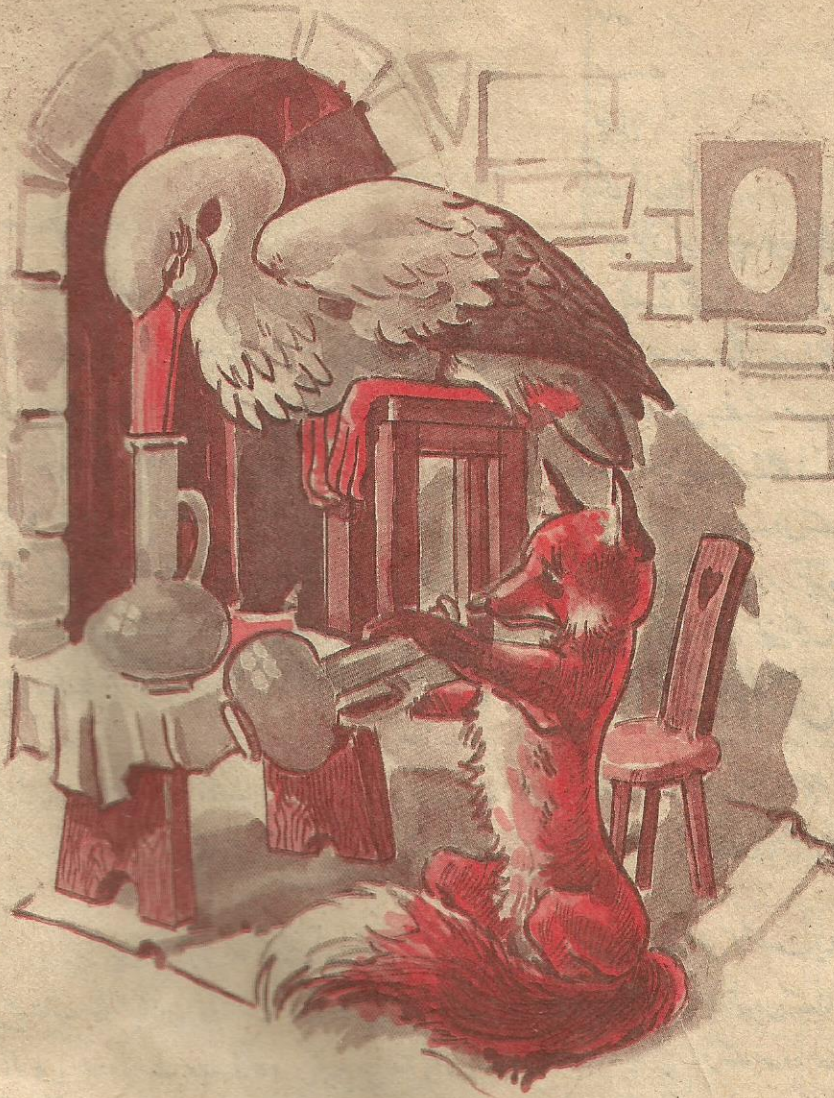
یہ کھیل بہ ظاہر آسان معلوم ہوتا ہے، مگر در اصل بہت مشکل ہے۔ اس میں وُہی بچے کام یاب ہوسکتے ہیں جن کی یادداشت اچھی ہو۔

کسی بڑے شخص کو منصف بنالیں۔ وہ کسی اٹلس یا جنرل نالج کی کتاب سے پانچ چھ شہروں کے نام پڑھے گا، آہستہ آہستہ، نہایت صاف اور واضح۔ اس کے بعد وہ مقابلے میں حصہ لینے والوں کو چند سکنڈ دے گا تاکہ وہ اُن ناموں کو خوب ذہن نشین کرلیں۔ اِس کے بعد وہ پھر اُن ناموں کو دوہرائے گا، مگر اس دفعہ انھیں گڈمڈ کر دے گا۔ یعنی آخری نام پہلے اور پہلے نام آخر میں۔ اور ـــ ایک نام چھوڑ جائے گا۔ یہ گم شدہ نام ہوگا۔

جو بچہ اس گم شدہ مقام کا نام بتا دے گا، وہ جیت جائے گا۔ اور دوسرے راؤنڈ میں اُسے منصف بنایا جائے گا۔

لمبے اور مشکل ناموں سے بچا جائے، کیونکہ اس کھیل کا مقصد یادداشت کا امتحان لینا ہے، تلفظ کا امتحان لینا نہیں۔

اگر مقابلے میں حصہ لینے والے لڑکے یا لڑکیاں یہ مقابلہ آسانی سے جیت لیں تو ناموں کی فہرست میں اضافہ کردیا جائے۔ مثلاً پانچ چھ کے بجائے آٹھ دس۔



سارس اور لومڑ

ڈاکٹر عبدالرؤف

ایک جنگل میں ایک لومڑ اور ایک سارس پاس پاس رہتے تھے۔ ایک دِن لومڑ نے سارس کو کھانے کی دعوت دی۔ چالاک لومڑ نے کھانے کی میز پر دو چوڑی چپٹی پلیٹیں سجا دیں اور اُن میں بڑا مزے دار شوربا ڈال دیا۔ سارس آیا تو دونوں کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔

سارس کو چپٹی پلیٹ سے شوربا پینے میں بہت دِقّت محسوس ہوئی تو مکّار لومڑ بولا: "اگر آپ کو میرا کھانا پسند نہیں ہے تو آپ کی پلیٹ کا شوربا بھی میں ہی پی لیتا ہوں۔" یہ کہا اور لومڑ غٹ غٹ کر کے سارس کی پلیٹ بھی چٹ کر گیا۔ بیچارہ سارس اپنے گھر بھوکا لوٹ آیا۔

اگلے روز سارس نے لومڑ کو کھانے کی دعوت پر اپنے گھر بُلایا۔ اُس نے لمبی گردن کے دو برتنوں میں شوربا ڈال کر میز پر رکھ دیا۔ سارس خود تو لمبی گردن والے برتن میں اپنی لمبی چونچ ڈال کر مزے مزے شوربا پیتا رہا، مگر لومڑ کو کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر سارس نے مسکراتے ہوئے کہا "شاید آپ کو میرا کھانا پسند نہیں آیا۔ چلیے اسے بھی میں ہی ختم کیے دیتا ہوں۔" اتنا کہا اور سارس نے صراحی دار برتن میں اپنی لمبی چونچ ڈبوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا شوربا چٹ کر گیا۔

چالاک لومڑ بہت کھسیانا ہوا۔

سچ ہے دوسروں سے ایسی حرکتیں نہیں کرنی چاہییں کہ جب دوسرے وہی حرکتیں آپ سے کریں تو آپ کو بُری لگیں۔



پاکستان کی تاریخ میں ستمبر 1965ء کی جنگ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ جنگ جو آج سے 23 سال پہلے لڑی گئی، ایک مختصر سی جنگ تھی جو صرف 17 دن لڑی گئی، لیکن اس نے یہ ثابت کر دیا کہ جنگ میں فوج کی تعداد اور اسلحہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کام یابی کے لیے جذبے اور ولولے کی ضرورت ہے۔

اگست 1965ء میں مجاہدینِ کشمیر نے اپنی گردن سے غلامی کا جُوا اُتار پھینکنے کے لیے بھارت کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کی۔ آزاد کشمیر کی فوجیں اُن کی مدد کے لیے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو گئیں اور اُنھوں نے مقبوضہ کشمیر کا کچھ علاقہ آزاد کرا لیا۔ اِس پر بھارتی حکومت بوکھلا گئی اور اُس کی فوجوں نے گجرات کے پاکستانی علاقے پر بمباری کر دی، جس سے کافی جانی اور مالی نقصان ہوا۔ اِس پر پاکستان کو، اپنی حفاظت کے لیے، بھارتی فوج کے خلاف جوابی کارروائی کرنی پڑی اور پاک فوج دُشمن کی فوجوں کو دھکیلتی ہوئی جمّوں تک پہنچ گئی۔

بھارت نے جب یہ دیکھا کہ پُورا کشمیر اُس کے ہاتھ سے نِکلا جا رہا ہے اور وُہ اِس محاذ پر پاکستان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو اُس نے بغیر اعلانِ جنگ کے لاہور پر حملہ کر دیا، اور اس کی فوجیں رات کی تاریکی میں یلغار کرتی ہوئی جلّو موڑ تک آ گئیں۔ بھارتی فوج کے کمانڈر نے، طاقت کے نشے میں، بدمست ہو کر یہ اعلان کیا کہ وہ شام تک لاہور پر قبضہ کر لے گا اور بھارتی فوج جِم خانہ کلب میں فتح کا جشن منائے گی۔ لیکن پاکستان کے جیالے سپاہیوں نے بی آر بی نہر پر دُشمن کی پیش قدمی روک دی اور اُسے بھاری نقصان پہنچایا۔

اب بھارتی فوج نے برکی محاذ پر دباؤ ڈالا۔ لیکن یہاں بھی مُٹھّی بھر پاکستانی فوج نے جس کی کمان میجر عزیز بھٹّی کر رہے تھے، جاں بازی اور شجاعت کے وُہ کارنامے دکھائے کہ ساری دُنیا عش عش کر اُٹھی۔ اِس محاذ پر میجر عزیز بھٹّی نے تین دِن تک دُشمن کو روکے رکھا اور بالآخر لڑتے ہُوئے شہید ہو گئے۔ اِس عظیم کارنامے کے صلے میں اُنھیں نشانِ حیدر کا اِعزاز مِلا۔ اِس اثنا میں اس دستے کی مدد کے لیے مزید پاکستانی دستے پُہنچ گئے تھے۔ اُنھوں نے سر ہتھیلی پر رکھ کر جوابی حملہ کیا اور دُشمن کی فوج کو پاکستانی سرحد سے پرے دھکیل دیا۔ افراتفری کے عالم میں بھارتی کمانڈر کو اپنی جیپ چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ قصُور کے محاذ پر دُشمن نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو پاکستانی فوج نے یہاں بھی اُسے ناکوں چنے چبوائے، اور آگے بڑھ کر کھیم کرن کے بھارتی قصبے پر قبضہ کر لیا۔

اِن محاذوں پر مُنھ کی کھانے کے بعد دُشمن نے سیال کوٹ کے محاذ پر حملہ کر دیا۔ یہاں چونڈا کے میدان میں ٹینکوں کی زبردست جنگ لڑی گئی جس میں پاکستان کا پلّا بھاری رہا اور اُس نے چونڈا کے میدان کو بھارتی ٹینکوں کا قبرستان بنا دیا۔ دُشمن نے راجپوتانہ کے محاذ پر بھی آگے بڑھنے کی کوشش کی، مگر یہاں بھی اُسے مار پڑی اور پاکستان کی فوج 20 میل تک بھارتی علاقے میں گھُس گئی۔

ہوائی جنگ میں بھی پاکستان نے دُشمن کے دانت کھٹّے کر دیے۔ ہمارے شاہینوں نے بہت سے بھارتی اڈّوں کو تہس نہس کر دیا اور جو بھارتی ہوائی جہاز ہمارے علاقوں میں آئے، اُن میں سے اکثر کو مار گرایا۔ پاکستان کی بحری فوج نے بھی دُشمن کے چھکّے چھُڑا دیے اور بھارتی بندرگاہ دوارکا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ غرض ہر محاذ پر فتح نے پاکستانی فوجوں کے قدم چُومے اور ہندوستانی فوجوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ اب بھارت نے عافیت اِسی میں سمجھی کہ کسی طرح جنگ بند ہو جائے۔ اُس نے اقوامِ متّحدہ سے جنگ بندی کی درخواست کی اور اِس بین الاقوامی اِدارے نے، سترہ دِن بعد، جنگ بند کرا دی۔

اِس جنگ کی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پُوری پاکستانی قوم نے اپنی بہادُر اور جاں باز فوج کا بھرپُور ساتھ دیا۔ سینکڑوں نوجوان، سر سے کفن باندھ کر، محاذِ جنگ پر پُہنچ گئے، اور اُنھوں نے مادرِ وطن کے دفاع کی خاطر جان کی بازی لگا دی۔

(محمود مسعود۔ لاہور)



شکاری کی روح

سیماں کمال صوفی

فضا میں خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ قصبے کے راستے دُور دُور تک ویران تھے۔ کٹی خالہ سلیمہ کے گھر چل تو پڑی تھی لیکن اب ماحول کی خاموشی اور سنّاٹے کو دیکھ کر اُس کا دِل ہول رہا تھا۔

ویسے کٹی ڈرپوک نہیں تھی۔ لیکن وہاں جیسی رُوحوں کی ڈراؤنی باتیں ہُوئی تھیں، اُن کے تصوّر سے اُس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ اُس نے اپنے دوستوں سے کہا بھی تھا کہ وُہ جلدی گھر جانا چاہتی ہے۔ خالہ سلیمہ انتظار کر رہی ہوں گی، مگر اُنھوں نے اسے باتوں میں ایسا گھیرا کہ شام پڑ گئی۔

اور اب تو شام کی روشنی بھی ایسی ملگجی ہو رہی تھی کہ اُسے کسی درخت کا سایہ بھی رُوح یا بھُوت دکھائی دیتا تھا اور ہوا پتّوں میں سرسراتی تو کسی بدرُوح کی آواز لگتی۔

اُنھوں نے قصّے بھی تو اُسے ایسے ہی سُنائے تھے۔ رُوحوں کے قِصّے اور اپنی بہادری کی داستانیں۔ اِسی لیے تو غریب کٹی اندر سے خوف زدہ ہونے کے باوجود گھر سے اکیلی جانے پر تیار ہو گئی تھی کہ وُہ لوگ کہیں اُسے بُزدل ہی نہ سمجھ لیں۔

اور اب خالہ سلیمہ کے گھر کی طرف جانے والے سُنسان راستے میں ہر ہر قدم پر اُس کا دِل کانپ رہا تھا۔ اُسے اپنے دوستوں کی سُنائی ہُوئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

کٹی موسمِ گرما کی چھٹیاں گزارنے اپنی خالہ سلیمہ کے گھر آئی ہُوئی تھی۔ اُس کے خالو شیر خان کی اِس قصبے میں ایک چھوٹی سی آٹے کی مشین تھی، اور کچھ کھیتی باڑی تھی۔ اور زمان احمد قصبے کے تھانے کے انچارج تھے۔ اُن کی بیوی رابعہ بیگم سے خالہ سلیمہ کی بہُت دوستی تھی۔ اِس لیے کٹی کے ساتھ ان کے تینوں بچّوں کامران، ریحان اور صائمہ کی خُوب دوستی ہو گئی۔

وُہ چاروں اکثر شام کو مِل بیٹھتے اور مُختلف کھیل کھیلتے۔ کبھی ایک دُوسرے کو قصّے کہانیاں سُناتے۔ یا تو وُہ تینوں خالہ سلیمہ کے گھر پہنچ جاتے یا پھر کٹی اُن کے گھر آ جاتی۔ آج شام بھی کٹی خالہ سلیمہ سے کہ کر اُن کے گھر چلی گئی تھی۔

خالہ سلیمہ اور اُن کے گھر کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ شام زیادہ ہُوئی تو کٹی نے سوچا کہ وہ تینوں اُس کو چھوڑ آئیں گے۔ لیکن ایک تو اُنھوں نے اُسے رُوحوں کے قصّے سُنائے، اُوپر سے کوئی چھوڑنے بھی نہ آیا۔ اور کٹی خُود کو بہادر ظاہر کرنا چاہتی تھی، اِس لیے اکیلی ہی خالہ سلیمہ کے گھر کی طرف چل پڑی۔ لیکن سڑک کے دونوں طرف، اُونچے درختوں کے درمیان چلتے ہُوئے، اُس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ دِل خوف سے ہول تھا اور پاؤں کانپ رہے تھے۔

درختوں سے گُزرنے والی تیز ہوا کی شُوں شُوں کسی رُوح کی پُکار لگ رہی تھی۔ پیر کسی خُشک پتّے پر پڑ جاتا تو یُوں لگتا جیسے بھُوت یا چڑیل نے سِسکی لی ہو۔ اس کا دِل اُچھل کر حلق میں آ جاتا۔

وہ تیز چلنا چاہتی تھی، لیکن ٹانگیں اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ اُس کے ذہن میں وُہ ساری باتیں گھُوم رہی تھیں جو کامی، ریحان اور صائمہ نے اُس کے ساتھ کی تھیں۔ کامران نے اُسے رُوحوں کے بارے میں بتایا تھا کہ وُہ لوگ جو اپنی موت نہیں مرتے، بلکہ کسی حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں، یا کوئی اُن کو قتل کر دیتا ہے یا کسی کو پھانسی ہو جاتی ہے، یا پھر شکار کھیلتے ہُوئے کوئی جانور کسی کو چیر پھاڑ دیتا ہے، تو ان لوگوں کی رُوحیں دُنیا میں بھٹکتی پھرتی ہیں۔

"کامی، کٹی کو وہ انکل رُستم والا قصہ سناؤ نا" صائمہ نے کہا تھا۔

"ہاں" کامی نے کہا "تین سال پہلے ابّو کے ایک شکاری دوست انکل رُستم کو یہیں، ہمارے قصبے کے قریب، جنگل میں ایک چیتے نے مار ڈالا تھا۔ اُن کی رُوح اب تک قصبے میں بھٹکتی ہے۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا" کٹی نے اپنے دِل کا خوف دبا کر لاپروائی سے کہا۔

"لو، ہم نے خُود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے" صائمہ نے آنکھیں پھاڑ کے کہا تھا۔

اُنھوں نے اُس روز خاکی رنگ کا شکاری لباس اور فُل بُوٹ پہنے ہُوئے تھے" ریحان نے بتایا تھا۔

"اور ان کی رُوح ہمیشہ اسی لباس میں نظر آتی ہے" صائمہ نے کہا تھا۔

کِٹی کے بدن میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ لیکن اُس نے اُن پر اپنا خوف ظاہر نہیں کیا۔

"میں تمھیں تفصیل سے بتاتا ہُوں" کامران نے کہا تھا "اُس وقت ہم تینوں زیادہ بڑے نہیں تھے، اور صائمہ تو کافی چھوٹی تھی۔ مگر ہمیں اچھی طرح یاد ہے۔ وُہ سردیوں کے دِن تھے۔ بس آج کل جیسا موسم تھا۔ لوگ سرِ شام اپنے گھروں میں بند ہو جاتے تھے۔ ہم بھی بند کمرے میں، بیڈ کے قریب بیٹھے، چلغوزے کھا رہے تھے کہ باہر کسی کُتّے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ ہم چونک گئے۔

"پھر دروازے کی گھنٹی بجی۔ ہمارا نوکر جو ابّو اور امّی کو چائے دے رہا تھا، باہر گیا، اور تھوڑی دیر بعد ہی ایک اُونچا لمبا شخص، شکاری لباس میں، ایک کُتّے کی زنجیر تھامے، نوکر کے ساتھ اندر آ گیا۔ ابّو بے ساختہ اُٹھ کر اُس سے گلے ملے۔ امّی نے بھی بڑی خُوشی سے اُس کا استقبال کیا۔

"پھر ابّو نے اس اجنبی سے ہمارا تعارف کرایا۔ وُہ ابّو کے بہُت اچھے دوست انکل رُستم تھے۔ اُنھوں نے بتایا کہ وُہ ہمارے قصبے میں چیتے کا شکار کھیلنے آئے ہیں۔ ابّو کو ڈیوٹی پر جانا تھا، اِس لیے اگلی صبح تڑکے ہی انکل رستم اکیلے ہی شکار کے لیے چلے گئے۔ ہم انھیں بڑے دروازے تک چھوڑنے گئے تھے۔ اُن کے کاندھے پر بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی لٹکی ہُوئی تھی، اور ہاتھ میں کُتّے کی زنجیر تھی۔ وُہ چلے گئے۔

"شام تک انھیں واپس آ جانا چاہیے تھا۔ مگر ابّو بھی لوٹ آئے۔ انکل کا کُچھ پتا نہ تھا۔ رات ہو گئی۔ ابّو امّی بہُت پریشان تھے۔ پھر ابّو اُن کا پتا کرنے نکلے۔ تب اُن کی کٹی پھٹی لاش جنگل سے ملی۔ اُنھیں ایک چیتے نے مار ڈالا تھا۔ ابّو نے ان کے رشتے داروں کو اطلاع دی اور ان کی لاش کو دفنا دیا گیا۔ بس اُس وقت سے اُن کی رُوح قصبے میں بھٹکتی پھرتی ہے۔"

"اور جب بھی دکھائی دیتی ہے، اُسی شکاری لباس میں" صائمہ نے بتایا "کاندھے پر بندُوق اور کارتوسوں کی پیٹی اور ہاتھ میں کُتّے کی زنجیر۔"

شام کے ملگجے اندھیرے میں، درختوں کے درمیان، سُنسان سڑک پر چلتے ہُوئے کِٹی کے کانوں میں صائمہ کے الفاظ گونجنے لگے۔

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟" کِٹی نے خُود کو تسلی دینے کے لیے کہا۔ اور عین اُسی وقت، کہیں دُور سے، اُسے کسی کُتّے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اُس کا دِل بڑے زور سے دھڑکا۔ اُس نے سوچا، شاید یہ اُس کا وہم ہو۔ لیکن دُور سے آتی آواز اب قریب آ گئی تھی۔

پھر اُس نے، کُچھ فاصلے پر، ایک لمبا سا سایہ دیکھا، جس کے کاندھے پر بندُوق تھی اور ہاتھ میں ایک کُتّے کی زنجیر۔ کُتّا ساتھ سے آگے آگے دوڑ رہا تھا۔ کِٹی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس نے بھاگنا چاہا، مگر پیر بندھ سے گئے۔ اب سایہ قریب آ رہا تھا اور اُس کا خاکی رنگ کا شکاری لباس کِٹی صاف دیکھ سکتی تھی۔ یکایک اُس نے پُوری قُوّت جمع کی اور پلٹ کر واپس دوڑنا شروع کر دیا۔

اُس کی پُشت پر کُتّا زور زور سے بھونک رہا تھا، اور دوڑتے ہُوئے اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی شکاری کی رُوح اُسے پیچھے سے دبوچ لے گی۔ کُتّے کے بھونکنے کی آواز، اُس کے پُوری قُوّت سے دوڑنے کے باوجُود نزدیک آتی جا رہی تھی۔ وُہ پیچھے مُڑ کر دیکھے بغیر دوڑتی رہی، تیز اور تیز۔ یہاں تک کہ اُسے اپنے دوستوں کا گھر دکھائی دینے لگا ــــــ اور پھر گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

اُسے ہوش آیا تو اُس کے گرد بہُت سے لوگ جمع تھے۔ پاس بیٹھی صائمہ کی امّی نے اُسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر پیار کیا۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ کامران، ریحان اور صائمہ بیٹھے مُسکرا رہے تھے۔ اُن کے ابّو، امّی بھی تھے۔ اور پھر ایک زوردار چیخ اس کے مُنھ سے نکلی، کیوں کہ شکاری کی رُوح بھی وہاں موجُود تھی اور اُس کا کُتّا بھی۔ اُس نے صائمہ کی امّی کی گود میں مُنھ چھپا لیا۔ وُہ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے پیار سے بولیں "بیٹے، گھبراؤ نہیں۔ یہ انکل رُستم ہیں، اُن کی رُوح نہیں۔"

کِٹی نے ڈرتے ڈرتے سر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ پیار سے مُسکرا رہے تھے۔

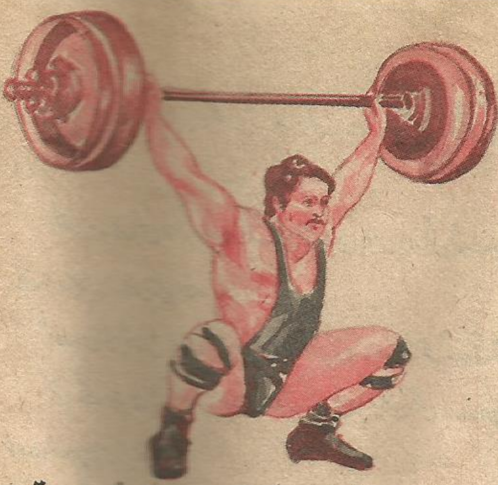
"ان شیطانوں نے ہمیں سب کُچھ بتا دیا ہے" صائمہ کے ابّو نے کہا "کل شام ہی تو رُستم صاحب ہمارے گھر آئے تھے، اور آج صبح شکار کے لیے گئے تھے۔ ان شریروں نے سب کُچھ تمھیں جھوٹ سُنایا تھا۔" کِٹی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وُہ شرمندہ تھی۔ اس کے شریر دوست مُسکرا رہے تھے۔

"چلو، اپنی دوست سے معافی مانگو" انکل رُستم نے کہا اور تینوں اُس کے نزدیک آ گئے۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی وہ چاروں مل کر قہقہے لگا رہے تھے۔

(انگریزی سے ماخوذ)

سپورٹس

ویٹ لِفٹنگ



ویٹ لِفٹنگ کا شمار قدیم ترین کھیلوں میں ہوتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وُہ اپنی طاقت کا اظہار کرے۔ اِنسانی قوّت آزمائی کے قصّے ہر دور میں عام رہے ہیں۔ لیکن آج کے جدید کھیل میں داخل ہونے تک اِنسانی قوت نے ایک لمبا سفر کیا ہے جو صدیوں پر پھیلا ہُوا ہے۔

تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ مضبُوط اور طاقتور جسم ہمیشہ ایک دُوسرے سے مُقابلہ کرتے رہے ہیں۔ اُس زمانے میں آج کل جیسا جدید سازو سامان تو موجُود نہ تھا، لیکن قُدرتی ذرائع اسے پُورا کر دیا کرتے تھے۔ مُقابلوں میں حصّہ لینے والے بھاری پتھر، درختوں کے موٹے تنے اور بھاری بھرکم جانور اُٹھا کر ایک دُوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

اِس قسم کے مقابلوں کو بین الاقوامی سطح پر لانے کا خواب سب سے پہلے بیرن پیرے ڈی کاؤبرٹن نے دیکھا جو 1896ء میں پُورا ہُوا اور ویٹ لفٹنگ کو اولمپک کھیلوں میں شامل کر لیا گیا۔

اِس کھیل کی نگران تنظیم کا نام انٹرنیشنل ویٹ لفٹنگ ہے اور مختلف ممالک کی تقریبًا ایک سو قومی تنظیمیں اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس فیڈریشن کا قیام 1920ء میں عمل میں آیا تھا۔

عرصۂ دراز تک بین الاقوامی مُقابلوں میں تین لِفٹس کا رواج رہا۔ (1) یعنی کلین اینڈ پریس (2) سنیچ (3) کلین اینڈ جرک۔ لیکن 1972ء میں غیر معمولی مُشکلات کی وجہ سے کلین اینڈ پریس کو منسُوخ کر دیا گیا۔

دُوسری جنگِ عظیم سے پہلے جرمنی کو اس کھیل میں اوّلیت حاصل تھی۔ 1946ء سے امریکا، رُوس اور مصر نے اس کھیل میں اپنا لوہا منوایا۔

بین الاقوامی مُقابلوں میں حصّہ لینے کے لیے نہ صرف غیر معمولی قوّت، بلکہ بلند حوصلہ، جذبے، چُستی، اور اعلیٰ کردار کا مالک ہونا بھی ضرُوری ہے۔

کھلاڑیوں کے جسمانی وزن کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی کی جاتی ہے جسے کلاس کہتے ہیں۔ بلحاظِ وزن کُل نو کلاسیں ہوتی ہیں۔ یعنی کم جسمانی وزن کے کھلاڑی چھوٹی یا ہلکی کلاس میں اور زیادہ وزن کے کھلاڑی بڑی یا وزنی کلاس میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ کلاسیں فلائی ویٹ سے شرُوع ہو کر سُوپر ہیوی ویٹ تک جاتی ہیں۔

اولمپک اور کامن ویلتھ کھیلوں میں ایک مُلک کے زیادہ سے زیادہ نو کھلاڑی شامل ہو سکتے ہیں۔ مقابلے کا فیصلہ کسی کھلاڑی کی تین میں سے دو بہترین لِفٹوں میں اُٹھائے گئے مجمُوعی وزن پر ہوتا ہے۔ سنیچ میں کھلاڑی آمنے سامنے رکھی ہُوئی بار کو ایک ہی کوشش میں سر کے اُوپر لے جاتا ہے۔

کلین اینڈ جرک میں کھلاڑی پہلے بار کو شانوں تک لاتا ہے اور اس کے بعد بار میں بنیادی اور مُعاون حرکت پیدا کرنے کے لیے گھٹنوں کو خم دیتے ہُوئے اسے بلند کرتا ہے۔

ہر کھلاڑی لِفٹر کو ہر لفٹ کے تین تین مواقع دیے جاتے ہیں لیکن پہلی لفٹ میں ناکامی کے بعد وزن کم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے لفٹر کو چاہیے کہ وُہ پہلے ہی سوچ سمجھ کر اتنا وزن لے جسے وُہ خود اعتمادی سے اُٹھا سکے۔

مُقابلے کی نگرانی تین ریفری کرتے ہیں۔ اور مقابلے کا نتیجہ دو کی رائے سے ہوتا ہے۔ اگر لفٹ ناکام یا خلافِ ضابطہ ہو تو ریفری سُرخ جھنڈی یا سُرخ روشنی سے اور اگر لفٹ کامیاب یا ضابطے کے مُطابق ہو تو سفید جھنڈی یا سفید روشنی سے اشارہ کرتا ہے۔

ویٹ لفٹنگ ہر کھیل کا بُنیادی تقاضا بھی ہے۔ اس لیے ویٹ لفٹنگ تقریبًا ہر کھیل سے تعلّق رکھنے والے کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے رگ پٹھے طاقت ور اور مضبُوط ہوتے ہیں اور عضلات میں قوت اور خُوب سختی پیدا ہوتی ہے۔ اس قسم کی ورزش میں بنچ پریس اور گردن پر ویٹ رکھ کر بیٹھکیں لگانا شامل ہے۔

بنچ پریس کا طریقہ یہ ہے کہ کھلاڑی کسی بنچ پر سیدھا لیٹ کر ویٹ کو دونوں بازوؤں سے تھام کر سینے کے اُوپر متوازن رکھتا ہے اور آہستہ آہستہ بازوؤں کو مع ویٹ کے آسمان کی طرف پہلے سیدھا کر دیتا ہے اور بعد میں خم پیدا کرتے ہُوئے واپس سینے پر لے آتا ہے۔ وُہ اِس عمل کو بار بار دُہراتا ہے۔

دُوسری ورزش میں کھلاڑی بار کو (مع ویٹ) اپنی گردن کی پُشت کی جانب کندھوں سے سہارا دیتے ہوئے رکھ لیتا ہے اور بیٹھکیں لگاتا ہے۔ اس سے پنڈلیوں اور رانوں کے عضلات بنتے ہیں۔

تیسری ورزش کو ڈیڈ لفٹ کہتے ہیں۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ مطلُوبہ وزن کی پلیٹیں بار میں ڈال کر زمین سے رانوں تک ویٹ کو اُٹھایا جاتا ہے۔ اس ورزش کے لیے چُستی کی نسبت قوّت کی زیادہ ضرُورت ہوتی ہے۔

دماغ لڑاؤ

داؤدی علمی مُعمّا

ا	ر	گ
ے	ع	ن
ت	ب	ز

1 ان ملے جُلے حروف میں ایک بُنیادی لفظ ہے۔ اس کا بتانا ضروری ہے۔ بُنیادی لفظ سے وہ لفظ مُراد ہے جو نقشے میں دیے گئے نو حروف سے مل کر بنتا ہے۔
2 دو حرفی لفظ قابلِ قبول نہ ہوگا۔ کوئی لفظ تین حروف سے کم کا نہ ہونا چاہیے۔
3 یہ بھی خیال رہے کہ ہ کو ھ (دو چشمی) نہ سمجھا جائے۔
4 انھی حروف کو ادل بدل کر کم سے کم پچاس الفاظ بنائیں۔
5 حل کے ساتھ کوپن بھیجنا لازمی ہے۔
6 حل بھیجنے کی آخری تاریخ 15 ستمبر ہے۔

50 یا اس سے زیادہ الفاظ بنانے والے کو 75 روپے کی کتابیں، دوسرے نمبر پر 60 روپے کی کتابیں اور تیسرے نمبر پر 50 روپے کی کتابیں دی جائیں گی۔ اس کے علاوہ 20 انعام پندرہ روپے کی کتابوں کے دیے جائیں گے۔

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ اس کوپن کا بھیجنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 15 ستمبر ہے۔

نام ____________ عمر ____________

پتا ____________________________

علمی مُعمّا اگست 1988ء کا بُنیادی لفظ

شرارت آمیز

فہرست انعام یافتگان

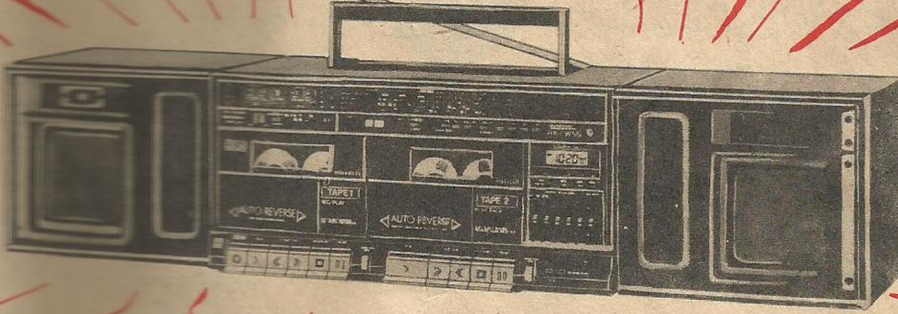
پہلا انعام: مریم فارقلیط سیما۔ مکان 1441 10/1 - 2 اسلام آباد 220 صحیح الفاظ

دُوسرا انعام: عارف ذی شان۔ ا۔ خرم روڈ۔ واہ کینٹ 205 صحیح الفاظ

تیسرا انعام: حسن خان ا۔ جی/ 48۔ تحصیل روڈ لاہور 202 صحیح الفاظ

پندرہ رُوپے کی کتابیں حاصل کرنے والے بچے

1 محمد عبدالمتین صدّیقی 672 سیٹلائٹ ٹاؤن بہاول پُور
2 تجمل الیاس 8/46 - 48/CB اسلام آباد کالونی، سمن آباد لاہور
3 سحر خلیق بی 1 لالہ رُخ۔ پوسٹ آفس روڈ واہ کینٹ
4 عمر مُنیر اور مثال مُنیر مکان 17/19 تاج پورہ سٹریٹ دارہ ارائیاں سیالکوٹ
5 میمونہ حمید کوٹھی نمبر 540 بی۔ پوائنٹ۔ 31 بابا لائن مغل پُورہ لاہور
6 شہزاد احمد، پائن ہلز پبلک سکول مری روڈ، ایبٹ آباد
7 یاسر شاہ معرفت شہزادہ عبدالرحمان ماسٹر۔ گلزار خیل محلہ پیر خیل مکان نمبر T 615 ضلع کوہاٹ
8 صائمہ خان کھوسہ مکان نمبر 2069/A عقب بکر منڈی، حضوری باغ روڈ مُلتان۔
9 سیّد محمد علی عبّاس شیرازی۔ 135۔ کینال کالونی۔ بہاول پُور
10 پرنس وسیم بن اشرف گلی نمبر 15 مکان نمبر 25 محلہ رحمانیہ۔ میاں چنّوں
11 توصیف حیدر شاہ ولد جاوید اقبال شاہ 84۔ گل زیب کالونی، سمن آباد لاہور
12 ثوبیہ باسط شیخ۔ گلی نمبر 2 مکان نمبر 8 سوئیکارنو بازار مغل پورہ لاہور
13 محمد احسن۔ ایجوکیشنل بک ڈپو چیچیاں، میرپور آزاد کشمیر۔ پوسٹ کوڈ 10350
14 عدنان خان۔ پاپوش نگر 225/AA۔ کراچی
15 آرزو ربانی معرفت شکیل احمد خان۔ ظہیر ہسپتال۔ شیخوپورہ۔
16 شبیل احمد ظہیر چودھری 77 سی۔ سول لائنز۔ شیخوپورہ
17 عمارہ حسن 246 جی۔ گلشن راوی۔ لاہور
18 محمد عمران نسیم۔ مکان 5/21 نیشنل مارکیٹ، اصغر مال سکیم راولپنڈی۔
19 شازیہ اکرم معرفت ڈاکٹر محمد اکرم طارق۔ فیصل چلڈرن کلینک نزد تحصیل چوک چکوال
20 علی رضا 8/48/9/49 اسلام آباد کالونی، سمن آباد۔ لاہور



ریڈیو آہستہ بجائیے

ریڈیو، ٹی وی، وڈیو آپ کی تفریح ہے۔ اِس سے لُطف اندوز ضرور ہوں۔ مگر اتنا یاد رہے کہ آپ کے پڑوس میں کوئی بیمار بھی ہو سکتا ہے اور کوئی طالبِ علم امتحان کی تیاری بھی کر سکتا ہے۔ اُن کے لیے اُونچی آواز تکلیف کا باعِث ہوگی۔

ریڈیو، ٹی وی اور وڈیو کی آواز آہستہ رکھیں اور اچھّے شہری ہونے کا ثبوت دیں۔

آپ کا خط ملا

پیارے ساتھیو، آپ کی باجی حاضر ہے۔ سب سے پہلے ہماری ایک بات غور سے سُنیں۔ کوئی چیز بھی لکھتے وقت سب سے اُوپر اپنا پُورا نام اور پتا لکھیں — کہانیاں صرف ہماری دی ہُوئی تصویروں پر لکھیں اور ایک صفحہ چھوڑ کر صاف سُتھری تحریریں۔ اور اب آئیے ماہ اگست کے شمارے پر آنے والے خطُوط دیکھتے ہیں :

سب سے پہلا خط ہے مُلتان کینٹ سے کامران خالد کا۔ لکھتے ہیں تعلیم و تربیت کا معیار کافی بلند ہو گیا ہے۔ نیا سائز سب سے مُنفرد نظر آتا ہے اور تصویری کہانیاں تو بہُت ہی دِل چسپ ہوتی ہیں۔ کُچھ ایسا ہی اگلا خط بھی ہے۔ مسرُور احمد اسلام آباد لکھتے ہیں کہ صفحات تو آپ نے زیادہ کر دیے ہیں لیکن قیمت کم نہیں کی۔ بھیا کامران اور بھیّا مسرُور، دیکھیے نا اچھی چیز کے تو اچھے ہی دام ہوتے ہیں۔ میمونہ صادق سیالکوٹ نے لکھا ہے کہ اگست کے شمارے میں وطن کی خاطر، وعدہ کرو بے حد پسند آئے۔ راولپنڈی سے بھیّا محمد ناصر کو وطن کی خاطر، باباجی، پُراسرار نقاب پوش، کاٹے کا علاج، چاند اور محترم پسند آئے۔ بہن رضوانہ حسن نے لکھا ہے اے حمید کی سیریل کافی دِل چسپ رہی۔

وسیم عبّاس سیالکوٹ سے لکھتے ہیں قدم اور باباجی اچھّی لگیں۔ پُراسرار نقاب پوش کی دُوسری قسط کا اِنتظار ہے۔ محمّد بن قاسم بہُت اچھّا جا رہا ہے۔ اب ایک تنقیدی خط ہے آزاد کشمیر سے مریم الیاس اور شفقت کا۔ لکھتے ہیں، ماہ اگست کا سرورق دیکھ کر مایُوسی ہُوئی۔ اِس طرح کے سرورق معصُوم بچّوں کے ذہنوں پر کیا تأثرات چھوڑیں گے؟ وطن کی خاطر کوئی خاص متاثر کُن نہ تھی۔ قدم خوب صُورت تھی۔ چاند معلُوماتی اور باباجی صحیح معنوں میں تعلیم و تربیت کی شان تھی۔ پانچ آدم خور اچھّی کہانی تھی۔ مگر "قبر میں چھلانگ لگا دو" بچّوں کے لیے بے حد غیر مناسب اور فضُول تھی۔ انسائیکلوپیڈیا اور تاریخی کہانی اچھّی لگی۔ قادر خان پشاور سے لکھتے ہیں اگست میں وطن کے موضُوع پر کہانیاں بہُت کم تھیں بلکہ صرف ایک تھی۔ بھیّا قادر، معلُوم ہوتا ہے آپ رسالہ غور سے نہیں پڑھتے۔ شرُوع کی چاروں کہانیاں وطن کے موضُوع پر تھیں۔ ذرا دوبارہ تو پڑھیں۔ گوجرانوالہ سے شہباز ناز نے لکھا ہے، ہماری ردّی کی ٹوکری۔ اب تو مان جاؤ۔ پہلا خط تو کھا گئیں۔ اب اپنی ذہانت کی کیاریوں سے محبّتوں چاہتوں کی مہکار اور رنگ برنگے پھُولوں سے مزیّن رسالہ کے لیے تحریر بھیج رہا ہُوں نجمہ یاسمین (شورکوٹ) لکھتی ہیں کہ کوکب کاظمی سے کہیں ہمارے شہر کی سیر بھی کروا دیں — بھیّا ذوالفقار حسین نقوی (کراچی) نے ماہ اگست کا شمارہ بہُت پسند کیا ہے۔

ثمانیہ قاضی کوہاٹ۔ ثمانیہ جی، بقر عید گزرنے کے بعد آپ کی کہانی مِلی۔ ابراہیم رفیع فیصل آباد، بھیّا مایُوسی گُناہ ہے۔ عائشہ خورشید گجرات۔ غلام مرتضےٰ رحیم یار خان۔ خط اور کہانی الگ الگ صفحے پر لکھا کریں۔ فرقان احمد، خط پُورے صفحے پر لکھا کریں۔ اویس رضوی کراچی، بھیّا اویس پرچے کی خوب صُورتی نے آپ کو دوبارہ پرچہ لینے پر آمادہ کیا۔ تو کیا قیمت میں اضافہ اِس خوب صُورتی میں بھلایا نہیں جا سکتا۔ محمّد ندیم سیال کوٹ، پہلے بھیجی ہُوئی کہانیاں ضائع کر دی گئی ہیں۔ اب ہر ماہ نئی تصویروں پر کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ عطیہ حبیب لاہور اچھّی بہن، آپ الگ الگ کاغذ پر جو چاہے بھیج سکتی ہیں۔ اے کے بٹ، آپ نام پُورا لکھا کریں۔ سہیل مشتاق محلہ فاروقیہ۔ بھیّا سہیل، اچھّے بھائی ناراض نہیں ہوتے۔ باری آنے پر آپ کی تصویر ضرُور چھپے گی۔ بانو طلعت بہاول پُور، ایک وقت میں ایک نام سے لکھا کریں۔

آپ تمام ساتھیوں کے خطُوط اور تحریریں ہمیں مِل چُکی ہیں

عدیل صفدر خان کراچی۔ انیلا سُلطان کراچی۔ محمّد اقبال کراچی۔ لبنیٰ کنول کراچی۔ فرح ناز کراچی۔ محمّد صدیق بلوچ کراچی۔ راحت صلاحُ الدّین کراچی۔ مختار احمد لاہور۔ ایاز عبدُاللہ لاہور۔ مونا نازش لاہور۔ عامر وحید قمر لاہور۔ سعدیہ سلیم لاہور۔ طاہر محمُود لاہور۔ رضوانہ حسن لاہور۔ فیروزہ، فائزہ لاہور۔ عامر چودھری لاہور۔ سائرہ لیاقت لاہور۔ کاشف عمران لاہور۔ سمعیہ کنول ہاشمی ملتان۔ عطیہ رحمٰن اور وسیم افتخار ملتان۔ اقصیٰ مقدس واہ کینٹ۔ طیب عظیم واہ کینٹ۔ حماد الرحمٰن واہ کینٹ۔ کرن ضیاء راولپنڈی۔ سنبل اشرف، قمر اشرف، عطیہ رحمٰن سپرا اور سعدیہ اشرف گوجرانوالہ۔ ثاقب مجید اوکاڑہ۔ وسیم عبّاس ساہیوال۔ پرنس وسیم بن اشرف میاں چنّوں۔ سائرہ ہاشمی اور عنبر اسلم آزاد کشمیر۔ لبنیٰ شفیع قصوُر۔ عشرت رانی شورکوٹ۔ ارشد صابر قادر پوراں۔ حسن رضا گوندل منڈی بہاء الدین۔ وسیم عبّاس سیالکوٹ۔ صائمہ گلزار منگلا کینٹ۔ احمد مشتاق سرائے عالم گیر۔ رافعہ اقبال بٹ گجرات۔ ناہد حسین شاہ کروڑی۔ سجّاد احمد میاں چنّوں۔ جاوید اقبال شاہ اور شکیل احمد نے جگہ کا نام نہیں لکھا۔ شازیہ حسن اور انور نواز ساہیوال۔ اقصیٰ فاخرہ بہاول پور۔ عبدالعلیم اعوان ایبٹ آباد۔ شہزاد حسین چکوال۔ ناہید حق نوشہرہ۔ افشاں سلیم جوہڑا۔ فضلُ الرحمٰن خٹک بنّوں۔ غلام مُصطفےٰ صادق آباد۔ کاشف علی، علی ایاز، مونا لیکا احمد، اسماء سعید لاہور۔ عمرانہ نورین، محمّد شہزاد پشاور۔ سیّدہ عاکف اصغر رحیم یار خان۔ فضلِ ربّی مردان۔ اخلاق حسین ہیرانی گڑھ۔ عشرت علی ساہیوال۔ فیاض ٹیپو کوہاٹ کینٹ۔ شفیق الرحمٰن، فیصل عزیز اٹک۔ معراج اختر گوجرانوالہ۔ ارم بیلا ڈی آئی جی خان۔



عامر محبوب 12 سال
مطالعہ۔ کرکٹ
الحاج ہاؤس۔ اندرون
ڈیراوری گیٹ۔ بہاول پور



صبغت اللہ 13 سال
قلمی دوستی
محلہ محمد شریف پاٹولی شاہی بازار
حیدرآباد (سندھ)



وسیم عباس 14 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا
معرفت شیخ غلام عباس مینجر باٹا شوز
سٹور۔ سیالکوٹ کینٹ



سید طاہر جلیل 13 سال
ہاکی کھیلنا
گلی نمبر 2 مکان نمبر 3 عقب
اسٹیل ملز۔ گلشن پارک مغل پورہ لاہور



رب نواز شاہین 14 سال
تجربے کرنا۔ ریکارڈ کرنا
بمقام ڈاک خانہ لدوہ محلہ ٹینکی
تحصیل تلہ گنگ۔ ضلع چکوال



جنید علی خان 13 سال
کرکٹ۔ مطالعہ
18/ 594 فیڈرل بی ایریا
کراچی نمبر 38



نعیم قمر خاں 13 سال
کرکٹ۔ کراٹے
110 - بی۔ سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ



بلال احمد 12 سال
بیڈمنٹن۔ کرکٹ
48/G-I گلبرگ III لاہور



ہارون شبیر 10 سال
کرکٹ۔ بیڈمنٹن
48-G-I گلبرگ III لاہور



مطلوب حسین 14 سال
نیک کام کرنا
بھٹی کریانہ سٹور، گلیانہ روڈ، کھاریاں



افتخار قریشی 11 سال
کرکٹ
بلاک نمبر 17 لغاری کالونی
ڈیرہ غازی خان



ندیم عباس 13 سال
فوٹوگرافی
اشرف فوٹو سٹوڈیو۔ مین بازار
حجرہ شاہ مقیم، ضلع اوکاڑہ



محمد نعیم 16 سال
کرکٹ
گلی نمبر 14 مکان نمبر 6 پرانی
میوہ منڈی فلیمنگ روڈ، لاہور



سلمان فاروق 8 سال
مطالعہ۔ قلمی دوستی
731/PD گلی نمبر 12۔ محلہ
محمود آباد۔ پنڈورا، راولپنڈی۔



سید فیصل عثمان 14 سال
قلمی دوستی
معصوم منزل، قادری سٹریٹ
اسلام گنج لاہور 2



اخلاق مشتاق احمد 14 سال
کرکٹ
مہر محمد مشتاق، فتح گڑھ، ہاشم پورہ
سیالکوٹ۔



محمد سلیم 11 سال
ٹکٹ جمع کرنا
D/269 سیٹلائٹ ٹاؤن
راول پنڈی



شیخ صلاح الدین 14 سال
قلمی دوستی۔ فٹ بال
معرفت شیخ عبدالرشید
ریڈیو مارکیٹ۔ بہاول نگر شہر



عمران 10 سال
ٹکٹ جمع کرنا
معرفت عمران کلینک
ہیرآباد۔ میرپور خاص (سندھ)



دانش ندیم 9 سال
کرکٹ
138 محلہ باغبان [illegible]
ملتان



محمد محسن امین 14 سال
مطالعہ
مکان نمبر D-328 بلاک
VIII [illegible] ساہیوال



زبیر منیر 14 سال
آٹوگراف لینا۔ مطالعہ
B-99 [illegible] بلاک۔
گلشن راوی۔ لاہور



[illegible] 14 سال
سوئمنگ۔ کرکٹ
علی محمد [illegible] کراچی

آیئے دوست بنائیں

ماہ ستمبر

قلمی دوستی کی اس محفل میں شریک ہونے کے لیے
یہ کوپن پُر کر کے اور تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
([illegible] نہیں بھیج سکتیں۔)

نام ________ عمر ________

مشاغل ________

پتا ________

عجیب ٹیکس

دُنیا کی تمام حکومتیں اپنے ملک کے باشندوں سے ٹیکس لیتی ہیں۔ یہ ٹیکس مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً جائیداد ٹیکس، آمدنی ٹیکس، تفریح ٹیکس وغیرہ وغیرہ۔ اگر حکومت ٹیکس نہ لے تو اس کے پاس پیسہ کہاں سے آئے اور پیسہ نہ ہوگا تو حکومت کا کام کاج کیسے چلے گا۔ ہر شخص چاہے امیر ہو یا غریب، مزدور ہو یا کسان، ملازم ہو یا تاجر، کسی نہ کسی شکل میں حکومت کو ٹیکس ضرور دیتا ہے۔

پہلے زمانے کے بادشاہوں کو رُوپے پیسے کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ اپنی رعایا سے بات بات پر ٹیکس لیتے تھے۔ بعض ٹیکس تو ایسے تھے جنھیں سُن کر ہنسی آجاتی ہے۔

ٹیکسوں کے معاملے میں انگلستان بہت بدنام ہے۔ پُرانے زمانے میں یہاں کے لوگوں کو عجیب وغریب ٹیکس دینا پڑتے تھے۔ مثلاً ایک بادشاہ ہنری ہشتم نے ڈاڑھیوں پر ٹیکس لگا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غریب لوگوں نے ڈاڑھیاں مُنڈوا دیں۔ اس بادشاہ کے زمانے میں صرف امیر لوگ ہی ڈاڑھی رکھ سکتے تھے۔

آج سے تقریباً 150 سال پہلے انگلستان کی حکومت نے ہیٹ پر ٹیکس لگا دیا تھا۔ جو شخص پانچ رُوپیہ کا ہیٹ خریدتا، اسے پچاس پیسے، دس رُوپیہ کا خریدتا تو ایک روپیہ اور بیس روپیہ کا خریدتا تو دو روپے ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ حکومت کی طرف سے پچاس پیسے، ایک روپیہ اور دو روپے کے ٹکٹ جاری کیے گئے تھے، جو لوگوں کو اپنے ہیٹوں کے اندر لگانے پڑتے تھے۔

ایک دفعہ ایک مُلزم عدالت میں پیش ہُوا۔ سرکاری وکیل نے اُس کے خلاف دُھواں دھار تقریر کی اور جج سے کہا کہ اُسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔ مُلزم کے کٹہرے کے پاس ایک کُرسی پڑی تھی۔ وکیل نے اپنا ہیٹ اتار کر اُس کرسی پر رکھ دیا تھا۔ اللہ جانے مُلزم کے جی میں کیا آئی، اُس نے وکیل کا ہیٹ اُٹھا کر اُس کے اندر جھانکا۔ اُس میں ٹکٹ نہیں لگا تھا۔ مُلزم نے وہ ہیٹ جج کو دکھایا، اور جج نے ٹیکس نہ دینے کے جُرم میں، وکیل کو سو روپے جُرمانہ کیا۔

انگلستان کے ایک وزیرِ خزانہ، ولیم پِٹ، نے گھڑیوں پر ٹیکس لگا دیا تھا۔ لوگوں نے گھڑیاں خریدنا چھوڑ دیں اور کارخانوں کو لاکھوں روپے کا نقصان ہُوا۔ اس پر حکومت نے ٹیکس واپس لے لیا۔

ڈاڑھی ٹیکس، ہیٹ ٹیکس اور گھڑی ٹیکس کے علاوہ انگلستان کی حکومتوں نے دستانوں اور گھروں کی کھڑکیوں پر بھی ٹیکس لگایا تھا۔ مگر لوگ بڑے کائیاں نکلے۔ انھوں نے دستانے پہننا چھوڑ دیے اور کھڑکیوں میں اینٹیں چُنوا دیں۔ مجبوراً حکومت کو یہ ٹیکس واپس لینا پڑے۔

جانور بھی خواب دیکھتے ہیں

خواب آپ ہی نہیں دیکھتے جانور بھی دیکھتے ہیں۔

کسی سوتے ہوئے کُتّے کو دیکھیے: اگر وہ دُم ہلائے تو سمجھ لیں کہ خواب میں کوئی ہڈی دیکھ رہا ہے یا آپ اُسے پیار کر رہے ہیں۔ اگر وہ غرّائے اور پیر پٹخے تو اس کا مطلب ہوگا کہ یا تو کسی شکار کا پیچھا کر رہا ہے یا کسی دشمن پر حملہ کر رہا ہے۔

بلّی بڑے سکون اور اطمینان سے سوتی ہے۔ اس کی کسی حرکت سے معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ خواب دیکھ رہی ہے یا نہیں۔ لیکن ہاتھی کوئی ڈراؤنا خواب دیکھے تو بے تحاشا چیخیں مارنے لگتا ہے۔

ایورسٹ یا چومولنگوما

کوہِ ہمالیہ کی چوٹی ایورسٹ دُنیا کی سب سے اُونچی چوٹی ہے۔ آپ کو یہ سُن کر شاید حیرت ہو کہ اس کا اصل نام ایورسٹ نہیں، چومولنگوما ہے۔ یہ ایک چینی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں سب سے اونچا پہاڑ۔ اُنیسویں صدی کے آخر میں ایک انگریز سر جارج ایورسٹ نے اس چوٹی کے آس پاس کے علاقے کا سروے کیا تھا، اس لیے انگریزوں نے چوٹی کا نام اُسی کے نام پر رکھ دیا۔

س۔ ل۔



آپ بھی پُوچھیے

س: آپ نے اگست کے تعلیم و تربیت میں دیوارِ چین کی لمبائی 1500 میل بتائی تھی۔ میں نے کسی جگہ 2000 میل پڑھا تھا (اسد محمود۔ کراچی)

ج: بعض لوگوں نے اس دیوار کی لمبائی 1500 میل اور بعض نے 3600 میل لکھی ہے۔ اتنا زمانہ گزرنے کی وجہ سے یہ دیوار کئی جگہ سے ڈھے گئی ہے اس لیے اس کی لمبائی میں اختلاف ہے۔ اونچائی میں بھی اختلاف ہے۔ بہرحال، زیادہ تر لوگوں نے اس کی اونچائی 30 فٹ بتائی ہے۔

س: دنیا کا سب سے زہریلا جانور کون سا ہے؟ (ذیشان احمد۔ لاہور)

ج: سمندری سانپوں سے لے کر سٹون فش تک، دنیا میں سیکڑوں زہریلے جانور پائے جاتے ہیں۔ لیکن سائنس دانوں نے ایک مینڈک کو دنیا کا سب سے زہریلا جانور قرار دیا ہے۔ یہ مینڈک وسطی اور جنوبی امریکا کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی کھال کی اندرونی تہہ میں زہر کے غدود ہوتے ہیں۔ سانپ بھی اسے کھاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ جن علاقوں میں یہ مینڈک پائے جاتے ہیں وہاں ریڈ انڈینوں کی بستیاں ہیں۔ وہ اِن مینڈکوں کا زہر اپنے تیروں پر لگاتے ہیں۔ جس جاندار کے یہ تیر لگ جائے، وہ چند سکنڈ میں تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔

س: سُنا ہے، سانپ اپنے شکار کو سر کی طرف سے کھاتا ہے (فیاض احمد۔ کوئٹہ)

ج: سانپ اپنے شکار (مینڈک وغیرہ) کو چباتا نہیں، سموچا نگل لیتا ہے اور نگلنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اُسے سر کی طرف سے نگلا جائے۔

جب سانپ کسی مینڈک یا پرندے کو سر کی طرف سے نگلتا ہے تو اُس کی ٹانگیں دُم کی طرف مُڑ جاتی ہیں اور اِس طرح نگلنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔ اگر وہ اُسے دُم کی طرف سے نگلنے کی کوشش کرے گا تو اُس کی ٹانگیں دائیں بائیں پھیل جائیں گی اور جسم کے بال بھی کھڑے ہوجائیں گے جس سے اُسے نگلنے میں بہت مشکل پیش آئے گی۔ اُلّو بھی اپنے شکار کو سر کی طرف سے ہی نگلتا ہے۔

س: دنیا کا سب سے لمبا آدمی کون تھا؟ (ریاض احمد شیخ۔ حیدر آباد)

ج: ریاست ہائے متحدہ امریکا کی ایک ریاست اِلی نائے کا ایک باشندہ رابرٹ وڈلو۔ اس کا قد 2.7 میٹر (تقریباً 9 فٹ) لمبا تھا۔ 1939ء میں 21 سال کی عمر میں اُس کا انتقال ہُوا۔

س: فیچر فلم کسے کہتے ہیں؟ (مشتاق محمد۔ ملتان)

ج: جن فلموں میں کوئی کہانی ہوتی ہے، وہ فیچر فلم (یا فکشن فلم) کہلاتی ہیں اور جن فلموں میں نری معلومات ہوں انھیں ڈاکومنٹری (دستاویزی) فلمیں کہتے ہیں، جیسے نیوز ریل، کسی خاص جگہ کا حال احوال یا تعلیمی فلمیں وغیرہ۔

س: دنیا کی پہلی یونی ورسٹی کہاں قائم ہوئی تھی؟ (محمد احمد صدیقی۔ ساہیوال)

ج: مصر کے شہر اسکندریہ میں، آج سے تقریباً دو ہزار سال پہلے سکندرِ اعظم کے حکم سے ایک کالج قائم کیا گیا تھا۔ غالباً یہی دنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی تھی۔

س: وہ کون سی چیز ہے جو ہاتھی کے برابر ہوتی ہے لیکن اُس کا وزن کچھ نہیں ہوتا؟ (طاہر نعیم۔ پشاور)

ج: ہاتھی کا سایہ۔ دیکھا! آپ کو ہرا دیا۔ اچھا، اب آپ کی عقل کا امتحان ہے۔ ایک سیب لیجیے۔ اُسے کمرے میں کسی ایسی جگہ رکھیے جہاں اُسے سب لوگ دیکھیں، صرف ایک شخص نہ دیکھ سکے۔ بتائیے، اُسے کس جگہ رکھیں گے؟ دوسرے بچّے بھی جواب دے سکتے ہیں۔

س: دنیا کا سب سے تیز رفتار جانور کون سا ہے؟ (عبدالعزیز۔ راولپنڈی)

ج: چیتا۔ یہ 110 کلومیٹر (70 میل) فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔ بھارت اور بنگلہ دیش کے جنگلوں میں ملتا ہے۔ افریقہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ بلّی کے خاندان سے ہے۔ شیر سے چھوٹا ہوتا ہے لیکن بہت خُوں خوار درندہ ہے۔

س: ہمارے ہاں، بڑے شہروں میں بعض سکولوں کا نام گرامر سکول ہوتا ہے۔ کیا ان میں صرف گرامر پڑھائی جاتی ہے؟ (نسیم اعجاز۔ کراچی)

ج: جی نہیں، گریمر کے ساتھ دوسرے مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ آج سے 600 سال قبل انگلینڈ میں اُن سکولوں کو گریمر سکول کا نام دیا گیا جن میں، دُوسرے مضمونوں کے ساتھ، لاطینی زبان کی گریمر لازمی پڑھائی جاتی تھی کیوں کہ اُس وقت کالج میں داخلے کے لیے لاطینی زبان کا جاننا ضروری تھا (س ل)



اگست 1988 کے مقابلے میں
انعام پانے والی کہانیاں

فرض شناسی

محمد احسن - چھچیاں، آزاد کشمیر

عامر ایک ہونہار لڑکا تھا۔ ہمیشہ ہر جماعت میں اچھے نمبروں سے کام یاب ہوتا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اس کے والد ایک سرکاری مُلازم تھے۔ عامر کا گاؤں ایک پہاڑی کے قریب تھا۔ اس پہاڑی کی سُرنگ میں سے ریلوے لائن گُزرتی تھی۔ عامر اپنے دوست شکیل کے ساتھ اکثر ریل گاڑی دیکھنے کے لیے اس پہاڑی پر جایا کرتا تھا۔ اُن کو چھک چھک کرتی، دھواں اُڑاتی سیٹی بجاتی ریل گاڑی بہت اچھی لگتی تھی۔

ایک دِن موسم بہت خُوش گوار تھا۔ ایسے میں عامر کا دل چاہا کہ وہ ریل گاڑی کو قریب سے دیکھے کیوں کہ ریل گاڑی دیکھے ہُوئے اُسے تقریباً ایک ہفتہ ہو چُکا تھا۔ اس لیے وہ اپنے دوست شکیل کے گھر اُسے لینے گیا۔ لیکن اُس دِن شکیل بیمار تھا۔ وہ نہ جا سکتا تھا۔ لہٰذا عامر اکیلے ہی پہاڑی کی طرف چل پڑا۔ وہ اُچھلتا کودتا، گنگناتا ہُوا پہاڑی کے اُس حصّے کی طرف جا رہا تھا جہاں سُرنگ تھی۔ آخر کچھ دیر کے بعد عامر سُرنگ کے قریب پہنچ گیا۔ اُس نے گھڑی دیکھی۔ ریل گاڑی کے آنے کا وقت ہونے والا تھا۔ جب وہ ذرا اور آگے بڑھا تو اُس کا دل دھک سے رہ گیا کیوں کہ سُرنگ سے ذرا آگے پٹڑی پر ایک بڑا سا درخت گرا ہُوا تھا۔ وہ چشم زدن میں سمجھ گیا کہ یہ مُلک دُشمن اور تخریب کار لوگوں کا کام ہے تاکہ جب ریل گاڑی سُرنگ کی دُوسری طرف سے اِدھر آئے تو درخت سے ٹکرا کر اُلٹ جائے اور سینکڑوں بے گناہ لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

اِتنے میں اُس نے ریل گاڑی کی آواز سُنی، جو سُرنگ کی دُوسری طرف سے آ رہی تھی۔ وہ ریل گاڑی کی جانب دیوانہ وار دوڑنے لگا۔ جب وہ سُرنگ سے باہر نِکلا تو ریل گاڑی سُرنگ سے تھوڑی دُور ہی رہ گئی تھی۔ وہ ہاتھ بلند کر کے ریل گاڑی کی طرف دوڑتا رہا۔ جب انجن ڈرائیور نے دیکھا کہ ایک لڑکا دوڑتا ہُوا ریل گاڑی کی طرف آ رہا ہے تو اُس نے سیٹی بجائی تاکہ وہ پٹڑی سے ہٹ جائے۔ مگر عامر اپنی جان کی پروا کیے بغیر دوڑتا ہی رہا۔ مجبوراً انجن ڈرائیور کو گاڑی روکنی پڑی۔ انجن ڈرائیور، گارڈ اور دُوسرے لوگ نیچے اُتر آئے۔ گارڈ نے عامر سے پُوچھا کہ اِس طرح کیوں دوڑ رہے تھے؟ تو عامر نے ساری بات بتا دی۔ سب لوگ خُوش ہُوئے کہ ریل گاڑی عامر کی فرض شناسی کی وجہ سے ایک بڑے حادثے کا شکار ہونے سے بچ گئی۔ گارڈ نے عامر کا نام اور پتا لکھا۔ پھر لوگوں نے مِل کر درخت کو پٹڑی سے ہٹایا اور ریل گاڑی خیریت کے ساتھ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پُورے گاؤں میں پھیل گئی۔ سب نے عامر کے کارنامے کی بڑی تعریف کی۔ دُوسرے دِن عامر کے اس کارنامے کے متعلق اخبارات میں خبریں شائع ہُوئیں۔ سب نے عامر کی اعلیٰ ہمّتی کو خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ کچھ دِنوں بعد عامر کے سکول میں ایک جلسہ ہُوا جس میں ضلع کے ڈپٹی کمشنر بھی تشریف لائے۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ نے عامر کی فرض شناسی کی خوب داد دی۔ تقریب کے آخر میں ضلع کے ڈپٹی کمشنر نے طالب علموں کی تالیوں کی زبردست گُونج میں ایک میڈل عامر کے سینے پر لگایا اور نقد انعام بھی دیا۔ عامر بہت خُوش تھا ــ یہ اُس کی فرض شناسی اور بہادری کا انعام تھا۔ (پہلا انعام: 70 رُوپے کی کتابیں)۔

نُعمان کی بہادری

عمران حسین ڈار - اسلام آباد

نُعمان کو ورزش کا بہت شوق تھا، کیوں کہ ورزش سے اِنسان کی صحت ٹھیک رہتی ہے۔ جس قوم کے نوجوان صحت مند ہوں گے وہ قوم اپنے ہر دشمن پر فتح یاب ہوگی۔ اِسی لیے نُعمان نے اپنی زندگی میں ورزش کو باقاعدگی سے شامل کر لیا تھا۔

اُس روز بھی صبح صبح وہ اپنے گھر سے نِکلا اور اِدھر اُدھر چہل قدمی کرنے کے بعد ٹہلتا ہُوا ریل کی پٹڑی کی طرف آ نِکلا جس کی دائیں جانب ایک سُرنگ تھی۔ اچانک اُس کی نگاہ پٹڑی پر گرے ہُوئے درخت پر پڑی جس کی وجہ سے راستہ رُک گیا تھا۔ نعمان سوچنے لگا کہ اگر ایسے میں ریل گاڑی آ جائے تو سُرنگ کی وجہ سے ڈرائیور درخت کو نہ دیکھ سکے گا اور ریل گاڑی درخت سے ٹکرا کر

اُلٹ جائے گی جس سے بے شمار انسان موت کا شکار ہو جائیں گے۔ بہت
سے بچے یتیم، لاتعداد عورتیں بیوہ اور کئی گھرانے بے سہارا ہو جائیں گے۔
وُہ تیزی سے گرے ہُوئے درخت کے پاس آیا۔ درخت کو کسی نے کاٹ کر
ریل گاڑی کی پٹڑی پر گرا دیا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی وطن دشمن کی کارستانی ہے۔
اس کے ذہن میں شعلے سے بھڑکے۔ اس کا سارا جسم غم و غصّے سے سُلگنے لگا۔
اُس نے آگے بڑھ کر درخت کو پٹڑی سے ہٹانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

اِتنے میں اُس کے کانوں میں ریل کی سیٹی کی آواز آئی۔ وُہ چونک پڑا۔
اُسے کچھ اور تو نہ سُوجھا، سُرنگ میں داخل ہو کر پٹڑی پر دوڑنے لگا اور سُرنگ
سے نکل کر جلد ہی دُوسری طرف آ گیا۔ سامنے سے ریل گاڑی فرّاٹے بھرتی چلی
آ رہی تھی۔ وُہ ہاتھ اُٹھائے شور مچاتا پٹڑی پر دوڑنے لگا۔ ریل گاڑی کی سیٹی
بار بار بجنے لگی۔ ڈرائیور نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ گاڑی آہستہ ہوتے ہوتے اُس
کے قریب آ کر رُک گئی۔ ریل گاڑی کا گارڈ اور مُسافر گاڑی سے اُتر کر اُس
کے پاس آئے تو اُس نے انھیں ساری صورتِ حال بتائی۔ وہ بہت خُوش
ہُوئے اور نعمان کو خُوب شاباش دی۔ دُوسرے دن مُلک بھر کے اخباروں
نے نعمان کا یہ کارنامہ پہلے صفحے پر شائع کیا اور حکومت سے سفارش کی کہ اس
بہادر اور وطن پرست لڑکے کو بڑے سے بڑا انعام دیا جائے۔

(دُوسرا انعام: 60 رُوپے کی کتابیں)

بہادر لڑکا

وقاص یُونس۔ گوجرانوالہ

احمد روزانہ سکول سے واپس آکر اپنے ابّا کو دوپہر کا کھانا دینے کھیتوں
میں جایا کرتا تھا۔ ان کے گاؤں کے پاس ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جس میں سے
ریلوے لائن گُزرتی تھی۔ ان کے کھیت ریلوے لائن کے دُوسری طرف تھے۔
اِس لیے احمد کو روزانہ ریل کی پٹڑی سے گزر کر کھیتوں میں جانا پڑتا تھا۔

ایک دن جب وہ کھانا دے کر واپس آ رہا تھا تو اُس نے سُرنگ کے
قریب ریل کی پٹڑی کے اُوپر ایک درخت گرا ہُوا دیکھا۔ اُس نے سوچا کہ اگر
گاڑی آ گئی تو اِس درخت سے ٹکرا کر اُلٹ جائے گی اور کئی قیمتی جانیں ضائع ہو
جائیں گی۔ درخت کافی بھاری تھا۔ وُہ اکیلا اُسے اُٹھا نہیں سکتا تھا۔ اِس لیے
اُس نے گاؤں واپس جا کر چند آدمیوں کو لانے کا فیصلہ کیا تاکہ سب مل کر درخت
کو اُٹھا سکیں۔

وُہ واپس جانے کے لیے مُڑا ہی تھا کہ دُور سے گاڑی کی سیٹی سُنائی
دی۔ وُہ ٹھٹھک کر رُک گیا۔ اب کیا کرنا چاہیے؟ اُس نے سوچا۔ وُہ گاؤں
واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ کسی طرح گاڑی کو درخت
تک پہنچنے سے پہلے ہی روکا جائے۔ وُہ پریشان ہو گیا۔ اچانک اس کے
ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ لیکن یہ بہت خطرناک تھی۔ اس ترکیب پر عمل کرنے
سے اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔ لیکن وہ ایک بہادر لڑکا تھا۔ اُس نے اپنی
زندگی پر ان سینکڑوں لوگوں کی زندگیوں کو ترجیح دی جو گاڑی میں سفر کر رہے تھے
اور پٹڑی کے درمیان گاڑی کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ زور زور سے ہاتھ ہلا ہلا کر
گاڑی کو رُکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

گاڑی کے ڈرائیور نے ایک لڑکے کو پٹڑی پر دوڑتے ہُوئے اور زور
زور سے ہاتھ ہلاتے دیکھا تو وُہ پریشان ہو گیا۔ اُسے خیال آیا کہ ضرور کوئی
گڑبڑ ہے۔ اُس نے فوراً بریک لگا دیے اور گاڑی کچھ آگے جا کر جھٹکے سے
رُک گئی۔ جھٹکے کی وجہ سے مُسافر اپنی نشستوں سے نیچے گر گئے تھے۔ انھیں
بہت غصّہ آ رہا تھا۔ وُہ اُٹھ کر گاڑی سے باہر آئے تاکہ اصل صورتِ حال کا پتا
چل سکے۔ ڈرائیور اور گارڈ بھی باہر آ چکے تھے۔ وُہ سب احمد کی طرف آئے
اور پُوچھا کہ وُہ گاڑی کی طرف کیوں دوڑ رہا تھا؟ احمد کا سانس پُھول گیا تھا اور
اُس کے مُنھ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ اُس نے بڑی مُشکل سے سانس پر قابُو
پاتے ہُوئے بتایا کہ سُرنگ کے دُوسری طرف، پٹڑی کے اُوپر، ایک
درخت گرا ہُوا ہے۔

یہ سُن کر سب لوگ سُرنگ کے دُوسری طرف گئے اور وہاں پٹڑی
کے اُوپر ایک بڑے سے درخت کو گرا دیکھ کر ان کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ تو
موت کے مُنھ میں جا رہے تھے اور ایک لڑکے نے اپنی جان پر کھیل کر اُن
کی جان بچالی تھی۔ انھوں نے مِل کر درخت کو پٹڑی سے ہٹایا۔ پھر وُہ احمد کو
اس کے گھر تک چھوڑنے گئے۔ احمد کے ماں باپ بھی بہت خُوش ہُوئے کہ
ان کے بیٹے نے سینکڑوں مُسافروں کی جان بچائی۔ وہاں سے رُخصت ہو کر سب
لوگ گاڑی کی طرف گئے اور اس میں بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ چند روز
بعد احمد کو ریلوے کی طرف سے اعزازی سند اور حکومت کی طرف سے تمغۂ جُرأت
دیا گیا۔

آپ نے دیکھا! احمد کی عقل مندی اور بہادری کی وجہ سے سینکڑوں لوگوں

کی جانیں بچ گئیں۔ اگر ہمارے مُلک کا ہر بچّہ احمد کی طرح بہادر بن جائے تو دُشمن ہمارے مُلک کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا۔

(تیسرا انعام : 40 رُوپے کی کتابیں)

اسلم کا کارنامہ

سیّد صولت علی۔ کراچی

اسلم ایک ذہین اور سمجھ دار لڑکا تھا۔ اُس کا گھر ریلوے لائن کے قریب تھا۔ وُہ روزانہ صبح سویرے سیر کو نکل جاتا تھا۔ ایک دِن حسبِ معمول وُہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دُور تک نکل گیا۔ اس وقت تیز و تُند ہوائیں چل رہی تھیں۔ اچانک اُس کی نظر سُرنگ کے کنارے ریلوے لائن پر پڑے ہُوئے درخت پر پڑی۔ جو غالباً تیز جھکّڑ کی وجہ سے اِس جگہ گر گیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اِس سے آنے والی ریل گاڑی کو حادثہ پیش آنے کا اندیشہ ہے، وہ گھبرا گیا اور اُس کو بچانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ اُس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی کہ وہ کسی طرح انجن ڈرائیور کو گاڑی ٹھہرانے کا سگنل دے۔ لہٰذا وُہ سرنگ میں سے گُزر کر ریلوے لائن پر دوڑنے لگا۔ دُور سے ٹرین کی سیٹی کی آواز سُنائی دی۔ ٹرین سُرنگ کے پاس آچکی تھی۔ وُہ دونوں ہاتھ اُوپر کر کے اِنجن ڈرائیور کو گاڑی ٹھہرانے کا اِشارہ کرنے لگا۔

انجن ڈرائیور نے ایک لڑکے کو ریلوے لائن کے درمیان بھاگتے اور اشارہ کرتے ہُوئے دیکھا تو ایک دم بریک لگا دیے۔ ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔ اسلم نے خُدا کا شکر ادا کیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ اُس کا چہرہ فرطِ مسرت سے تمتا رہا تھا۔ ریلوے گارڈ نے قریب آکر پُوچھا کہ تُم نے ٹرین کیوں رکوائی؟ تو اُس نے سارا ماجرا بیان کیا۔ گارڈ اس کی عقل مندی سے بہُت متاثر ہُوا، اور مُسافروں نے بھی اُسے شاباش دی۔

اگلے دِن اِس خبر کے ساتھ اخباروں میں اسلم کی تصویر بھی چھپی اور اس ذہین بچّے کو حکُومت کی طرف سے گولڈ میڈل اور مُختلف جماعتوں کی جانب سے قیمتی انعامات بھی مِلے۔ (چوتھا انعام : 30 رُوپے کی کتابیں)۔



واہ وا! شاباش لڑکے

عمران رحمان۔ راولپنڈی کینٹ

سلیم کے والد بھلائی کے کاموں میں حصّہ لیتے تھے، اِس لیے سلیم کی بھی کوشش ہوتی تھی کہ وہ بھی کسی کے کام آسکے۔ اُسے جب بھی کوئی موقع ملتا، وُہ ضرُور کسی کی مدد کرتا۔ اُس کا مکان ریلوے لائن کے پاس ہی تھا۔ اِس لیے اُسے ہر آنے جانے والی گاڑی کے وقت کا پتا ہوتا تھا۔ اُس کی عادت تھی کہ وُہ ہر شام سیر کرنے کے لیے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔

ایک دن اُس نے دیکھا کہ ریلوے لائن کے اُوپر ایک بڑا سا پیڑ گرا پڑا ہے، جس سے بہُت بڑا حادثہ ہو سکتا تھا۔ اُس نے اپنی گھڑی میں ٹائم دیکھا تو گاڑی کے آنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ چُوں کہ پیڑ سُرنگ کے سامنے گرا پڑا تھا، اِس لیے اُس کا نظر آنا مُشکل تھا۔ سلیم نے بھاگم بھاگ سُرنگ پار کی تو سامنے سے ریل گاڑی آتی دکھائی دی۔ اُس نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر پٹڑی پر بھاگنا شرُوع کر دیا اور ہاتھ بلند کر کے ڈرائیور کو رُکنے کا اشارہ کرنے لگا۔

ڈرائیور نے جب ایک بچّے کو دُور سے اِس طرح اشارے کرتے دیکھا تو وُہ سمجھ گیا کہ کوئی خطرناک بات ہے۔ اُس نے ریل گاڑی روک لی۔ سلیم نے اُسے ساری بات بتائی۔ اُس علاقے میں رات کے وقت بڑی تیز آندھی آئی تھی جس کی وجہ سے وُہ درخت گر پڑا تھا۔ کُچھ مُسافر گاڑی کے رُکنے کی وجہ معلوم کرنے کے لیے نیچے اُتر آئے۔ پھر کُچھ مُسافروں کی مدد سے اُس پیڑ کو ہٹایا گیا۔ سب نے سلیم کا بہُت شکریہ ادا کیا۔

گارڈ نے سٹیشن پہنچ کر سٹیشن ماسٹر کو ساری بات بتائی اور سفارش کی کہ سلیم کو انعام ملنا چاہیے کیوں کہ اُس نے اِتنے سارے لوگوں کی جان بچائی ہے۔ سٹیشن ماسٹر نے یہ بات ریلوے چیئرمین کو بتائی۔ پھر ایک بڑے جلسے میں سلیم کو گولڈ میڈل اور دس ہزار رُوپے کا اِنعام دیا گیا۔ سلیم بہُت خوش تھا۔ اُس کے ابّو نے اُسے شاباش دی اور کہا "دُوسروں کے کام آنا بہُت بڑی نیکی ہے۔" (پانچواں اِنعام : 20 رُوپے کی کتابیں)۔

اِن بچّوں کی کہانیاں بھی پسند آئیں :

لاہور : اے کے بٹ، افتخار صابر، عرفان اکرم علی، محمّد عاطف، عمارہ رشید،

محمد جاوید، صائمہ مسعود، فریدہ شوکت، عمیر بخاری، بابر غزنوی، سارہ بخاری، شگفتہ جبیں، ثروت منیر، شجاع ارم، فرح دیبا، فرزانہ اسرار، سراج گُل، جویریہ نسیم قریشی، ثروت ناز بھٹی، عثمان ظفر، فریحہ چودھری، وردہ اقبال، سعدیہ سلیم، بشریٰ نذیر، ابراہیم حنیف الرحمٰن، منزار عارف، مونا نازش، سلمان ماجد، محمد علی، جویریہ جہاں گیر، ماہا فیاض، ذنوبیہ فیاض، محمد عاصم، شہزاد ریاض، سہیل ظفر۔

کراچی : الُفت شاہین، محمد اقبال، ثاقب عبدالرزاق، عبدُالکامران، رخشندہ نلاہد، محمد راشد، زاہد شفیع، مودود احمد۔

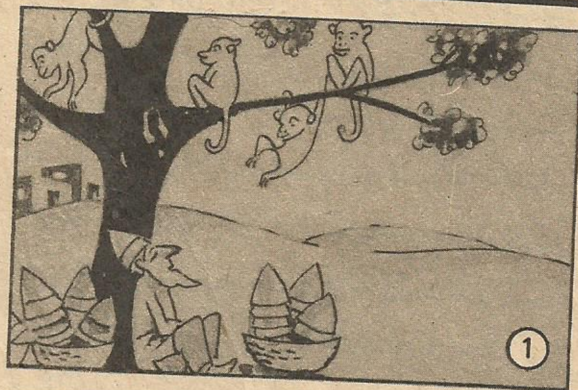
راولپنڈی : شہزاد فیصل، عدنان فتھانی، اسد نعیم جنجوعہ، رابعہ حامد، تہمینہ نثار، طاہرہ نثار، عدنان قیوم راجا، عبدُالرؤف خان، فاطمہ مسعود، ثوبیہ شوکت، عمیل عبّاس، فیصل اختر۔

اِسلام آباد : مسرُور احمد، یاسر نذیر، اویس محمّد، سعید عبّاس مرزا، اظفر فاروقی، احسان الکبیر، عثمان احمد، عامر فیض، عطیہ رحمٰن۔

مُلتان : جویریہ ریاض، ارشد صابر، وقار حسین، آمنہ حسین۔

شازیہ شاکر، غزالہ ناہید، محمد پرویز کندی میانوالی۔ ندیم اکرم خان شجاع آباد۔ رفیق تبسم، شکیل احمد پیر محل۔ حارث مدثر اٹک۔ سلطان محمُود کبرن سلیم، صائمہ گلزار منگلا کینٹ۔ ریاست محمود ایبٹ آباد۔ علی عمران میلسی۔ ناہید حق نوشہرہ۔ عابد محمُود، عثمان افضل خان واہ کینٹ۔ سعدیہ ظفر سرگودھا۔ محمد مسعود، ارم، عنبر اسلم آزاد کشمیر۔ محمد یاسمین شورکوٹ، ادریس شمیم، جویریہ خالد، شہباز ناز گوجرانوالہ۔ نادر حسین ڈی آئی جی خان، محمّد عمر امجد، خاور لطیف، کاشف فراز مون ساہیوال۔ سبین نواز، ادریس قریشی منڈی بہاء الدین۔ رابعہ تبسّم، نبیلہ نورین فیصل آباد۔ علی جنید چونیاں۔ انعام اللّٰہ گجرات۔ عائشہ حبیب، عدنان حبیب، فائزہ حبیب سیالکوٹ۔ فضلِ ربّی مردان۔ نبیل احمد، خان قادر خان پشاور۔ محمّد نظام، فرزانہ نذیر لوہرے والا۔ صبیحہ خانم، پرنس وسیم اشرف میاں چنّوں۔ منیزہ بانو جہلم۔ فرح چودھری لالہ مُوسیٰ۔ حنا شاہین، نورین افشاں ٹیکسلا کینٹ۔ سجّاد شبّیر جھنگ۔ عشرت ندیم زاہد رحیم یار خان۔ محمّد علی عبّاس شیرازی بہاول پور۔ عابد خان نوشہرہ۔











تصویری کہانی

ان تصویروں کی مدد سے کہانی لکھیں اور 200 روپے کے انعامات حاصل کریں۔

کہانی بھیجنے کی آخری تاریخ 10 ستمبر 1988ء ہے

فرصت کے کھیل

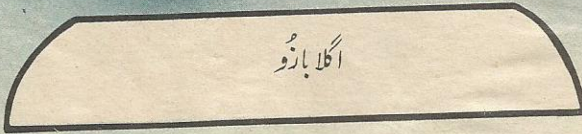


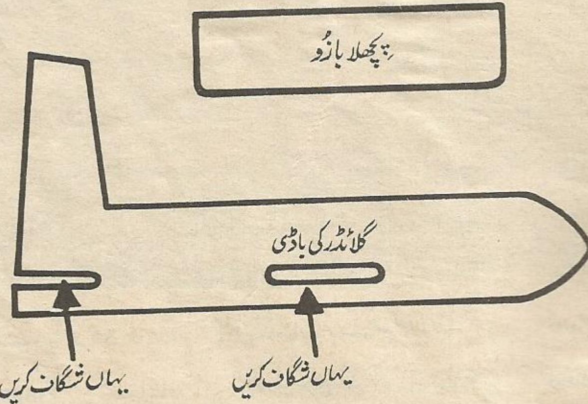
گلائڈر بنائیے

ایک پتلا گتا لیجیے (جوتوں کے ڈبے کا گتا مناسب رہے گا)۔ اِس گتے پر، کاربن پیپر سے، نیچے دیے ہوئے گلائڈر کے اگلے، پچھلے بازو اور باڈی کے خاکے اُتاریے۔ اب اُنھیں قینچی سے کاٹ لیجیے۔ گلائڈر کی باڈی میں، جہاں تیر کے نشان لگے ہیں چاقو سے شگاف کیجیے۔ اِن میں اگلا اور پچھلا بازو لگا دیجیے۔

(تصویر دیکھیے)۔ باڈی کی نوک پر ایک پیپر کلپ لگائیے، اور پھر اُس پر اپنا من پسند رنگ کر دیجیے۔

اب اِسے ہوا میں اُچھال کر اُڑائیے۔





اُڑن غبارا

درمیانے سائز کے غبارے میں ہوا بھریے۔ اس پر مارکر سے مسخرے کا چہرہ بنائیے۔ اس کے بعد اُس کی گانٹھ پر ربربینڈ باندھیے، خُوب مضبُوط۔

ربربینڈ کو گتے کی نلکی (ٹیوب) میں سے نِکال کر بائیں ہاتھ میں پکڑ لیجیے۔

دائیں ہاتھ سے نلکی کو تھامے رکھیے۔ وُہ غبارے کے ساتھ لگی رہے۔

اب ربربینڈ کو زور سے کھینچیے، اور پھر ایک دم چھوڑ دیجیے۔ غبارا ڈوں کر کے ہوا میں اُڑ جائے گا۔



ہمارا وطن

پشاور

کوکب کاظمی

پاکستان کا قدیم اور تاریخی شہر پشاور صوبہ سرحد کا صدر مقام ہے۔ اس کا قدیم نام پشاپورہ تھا۔ یہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں، پھولوں کا شہر۔ شہنشاہ اکبر نے اِسے پشاور کا نام دیا۔ پُرانے زمانے میں یہ شہر گندھارا سلطنت کا دارلحکومت تھا۔ مشہور درۂ خیبر یہاں سے گیارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ برِصغیر پاک و ہند میں (سوائے انگریزوں کے) جتنے حملہ آور آئے، اسی درے کے راستے آئے۔ اِن میں ایرانی، افغانی اور مُغل خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

اِس تاریخی شہر پر اُنیسویں صدی کے آغاز میں سکھوں نے قبضہ کیا اور 1848ء میں یہ انگریزوں کے قبضے میں آیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اِسے شمال مغربی سرحدی صُوبے کا دارلحکومت بنا دیا گیا۔ پشاور کے عجائب گھر میں مہاتما بدھ اور قدیم ہندو راجاؤں کشن اور کنشک کے آثار موجود ہیں۔ دُوسری صدی کا بنا ہُوا اسٹوپا بھی یہاں موجود ہے۔ یہاں سے ایک ریلوے لائن لنڈی کوتل تک گئی ہے۔

پشاور کے شمال اور جنوب میں قبائلی علاقے پھیلے ہُوئے ہیں۔ یہاں کے لوگ بہُت بہادُر اور خُود دار ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بہُت مہمان نواز بھی ہیں۔ یہ لوگ پاک افغان سرحد کے علاوہ درۂ خیبر، درۂ ٹوچی، درۂ کومل اور پاکستان کے دُوسرے علاقوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

ایک زمانے میں پشاور شہر کے گرد دیوار تھی اور اس کے سولہ دروازے تھے۔ شہر کے مغربی اور مشرقی حصّوں کی جانب ایک بہُت بڑا قلعہ ہے جسے قلعہ بالاحصار کہا جاتا ہے۔ راولپنڈی یا خیبر سے آتے ہُوئے یہ قلعہ راستے میں آتا ہے۔ یہ قلعہ 30-1526ء میں مُغل شہنشاہ بابر نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے بعد 1830ء میں اسے پشاور کے سِکھ گورنر ہری سنگھ نلوہ نے دوبارہ تعمیر کرایا۔

پشاور کا مشہور بازار قصّہ خوانی بازار ہے۔ آپ نے یقیناً اس کا نام سُنا ہوگا۔ شہر کا مشہُور کابلی دروازہ (جس کا اب صرف نام باقی ہے) قصّہ خوانی بازار کا دروازہ تھا۔ اِس بازار کا یہ نام اس طرح پڑا کہ عام طور پر سیّاح اور اِردگرد کے قصبوں کے لوگ یہاں شام کے وقت پیشہ ور کہانی سُنانے والوں سے کہانیاں سُنا کرتے تھے اور ساتھ ساتھ قہوہ بھی پیا جاتا تھا۔ پھلوں کی بےشمار دُکانوں کے علاوہ یہاں پشاور کی خاص روٹی، چپل کباب اور تکّوں کی بھی بہت سی دُکانیں ہیں۔

چمڑے کا سامان پشاور میں وافر مقدار میں بنتا ہے۔ پشاوری چپل کا نام تو آپ نے ضرور سُنا ہوگا۔ اس کے علاوہ سینڈل، کارتوسوں کی پیٹیاں اور پستول رکھنے کی تھیلی، عام پیٹیاں اور سُوٹ کیس بھی بنتے ہیں۔

قصّہ خوانی بازار سے بائیں طرف مُڑیں تو تانبے کی بنی ہُوئی اشیا کی دُکانیں آجاتی ہیں۔ ان دُکانوں سے آپ کو نقشین زیورات، پیالے، پلیٹیں اور اسی قسم کی اشیا مل سکتی ہیں۔

یہیں سے تھوڑا اور آگے جائیں تو چوک یادگار آجاتا ہے۔ اس کے قریب ہی کلاک ٹاور اور چند قدم آگے پشاور کی مشہُور اور خُوب صُورت مسجد مہابت خان ہے۔ یہ مسجد مُغل شہنشاہ شاہ جہاں کے عہدِ حکومت میں پشاور کے گورنر مہابت خان نے 1670ء میں تعمیر کرائی تھی۔

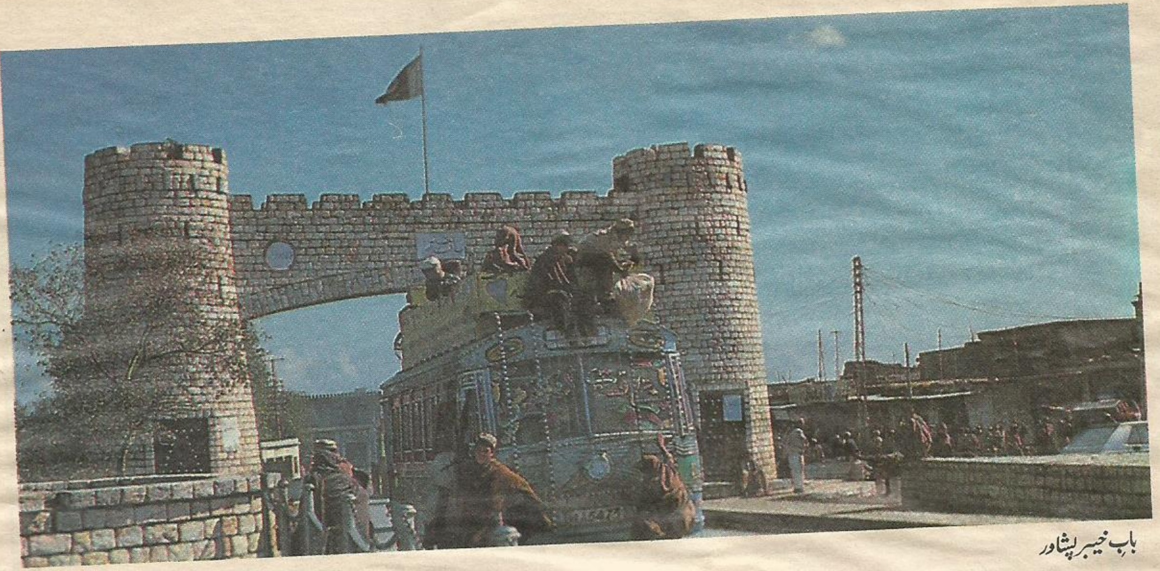
مشرق کی جانب سڑک دو اور تین منزلہ مکانوں کے درمیان سے ہوکر گزرتی ہے۔ زیادہ تر مکانات کچّی اینٹوں کے بنے ہُوئے ہیں اور ان کے دروازوں اور بالکونیوں پر بہُت خُوب صُورت نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ یہ سڑک جہاں ختم ہوتی ہے، وہاں آپ کو ایک وسیع عمارت نظر آئے گی، جس کے بڑے بڑے پھاٹک دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کردیتے ہیں۔ یہ تاریخی عمارت صدیوں پہلے مہاتما بدھ کا اسٹوپا تھی۔ پھر ہندوؤں کا مندر بنی اور اس کے بعد مُغلیہ دورِ حکومت میں اِسے مُغل سرائے بنا دیا گیا۔

قدیم پشاور کی گلیاں، مکانات اور دُوسرے تاریخی مقامات ہی اصل پشاور ہیں۔ لیکن پُرانے شہر کے ساتھ ساتھ نئے پشاور کی بھی خاص اہمیت ہے۔ نیا پشاور ریلوے لائن کی دُوسری جانب چھاؤنی کے علاقے میں آباد کیا گیا ہے۔ چھاؤنی یا صدر کے اس علاقے میں سب سے خُوب صُورت جگہ خالد بن ولید باغ ہے۔ یہ باغ مُغلیہ دور میں بنایا گیا تھا۔ یہاں اُونچے اُونچے درخت اور خُوش نُما گلابوں کے تختے بڑا دل کش نظارہ پیش کرتے ہیں۔ اِس کے علاوہ یہاں کے شاہی باغ اور وزیر باغ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

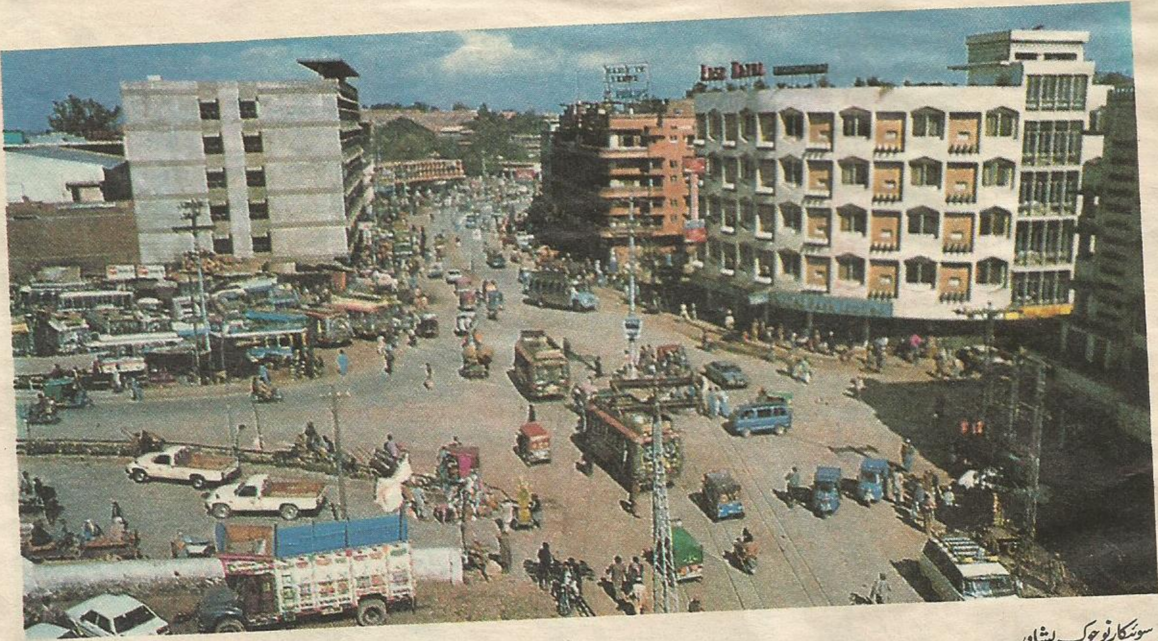
صدر ہی میں گورنر ہاؤس کی شان دار عمارت، جدید ہوٹل، مشنری ایڈورڈز کالج، عجائب گھر اور خُوب صُورت شاپنگ سنٹر واقع ہیں۔

خیبر کی جانب جانے والی سڑک پر اکیڈمی آف رُورل ڈویلپمنٹ، ٹیچرز ٹریننگ کالج اور ریسرچ کونسل کی شان دار عمارتیں ہیں۔

پشاور یُونیورسٹی جدید پشاور کی نُمائندگی کرتی ہے اور پاکستان کی چند بہترین یُونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔ اس کے علاوہ قدیم درس گاہوں میں



باب خیبر پشاور



سوئیکارنو چوک پشاور

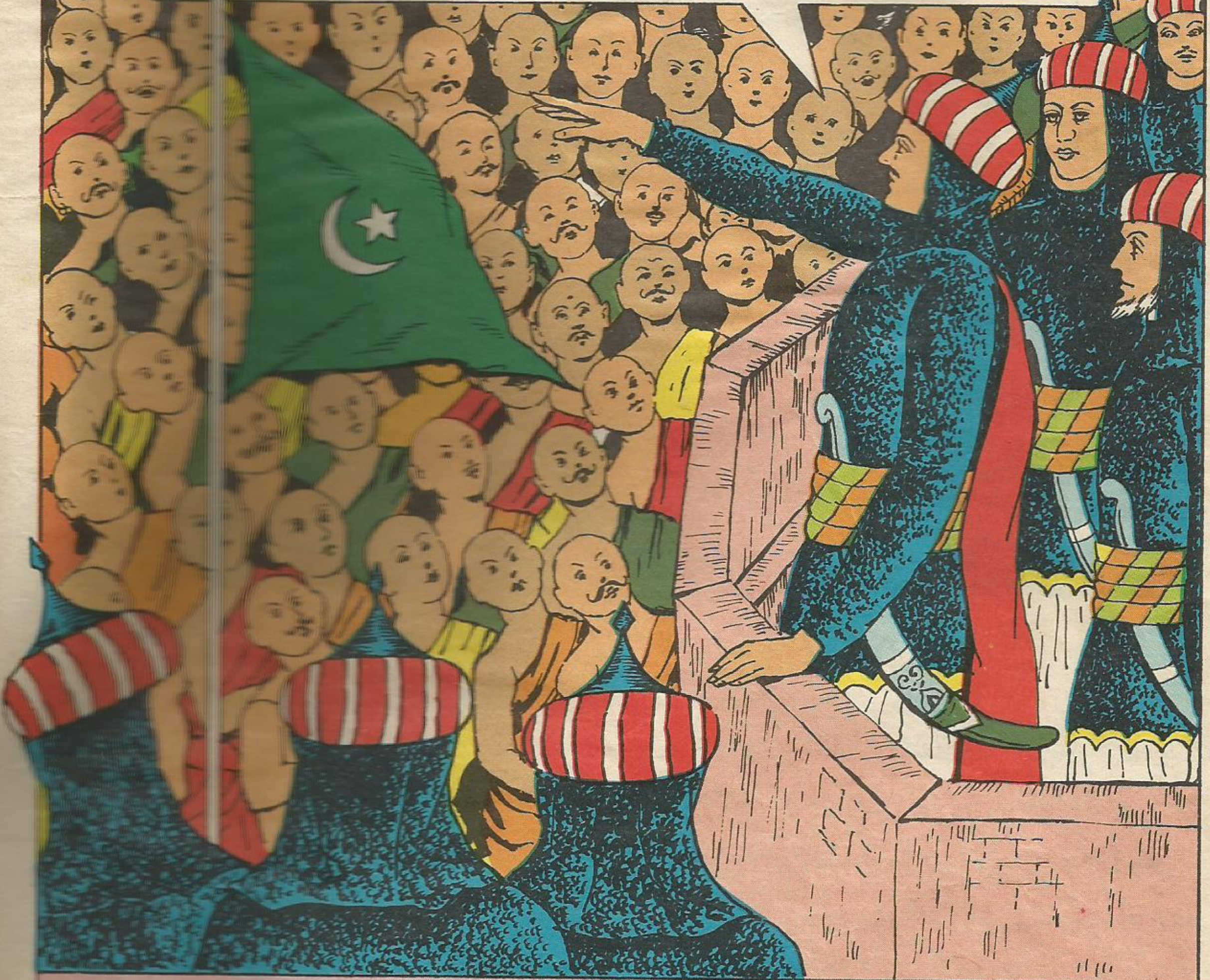
اسلامیہ کالج قابلِ ذکر ہے جو 63 سال سے اس خطے میں علم کی روشنی پھیلا رہا ہے۔

اب کچھ ذکر ہو جائے درۂ خیبر کا جو اِس علاقے کا اہم ترین مقام ہے۔ یہ
وب صورت درہ سُلیمان کی پہاڑیوں میں واقع ہے۔ اِن پہاڑیوں کا راستہ
یں تو ڈیڑھ کلومیٹر چوڑا ہے اور کہیں صِرف 52 فُٹ۔ اِس کے قریب ہی
لعہ جمرُود ہے۔

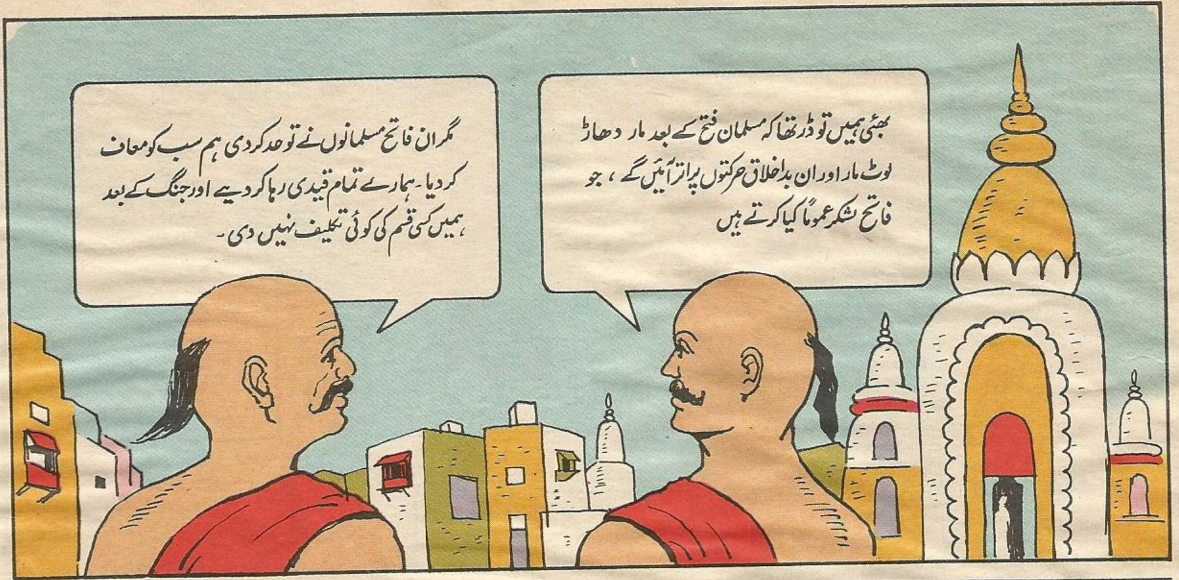
دُوسرا اہم درۂ آدم خیل ہے، جو پشاور کے جنُوب میں 42 کلومیٹر کے
صلے پر ہے۔ یہ درہ دیسی اسلحہ بنانے کا بہُت بڑا مرکز ہے اور کوئی سو سال
ے قبائلی علاقوں کو اسلحہ مُہیا کر رہا ہے۔ اس درے کے گاؤں کا تقریباً ہر مکان
بندوقوں کی فیکٹری ہے۔

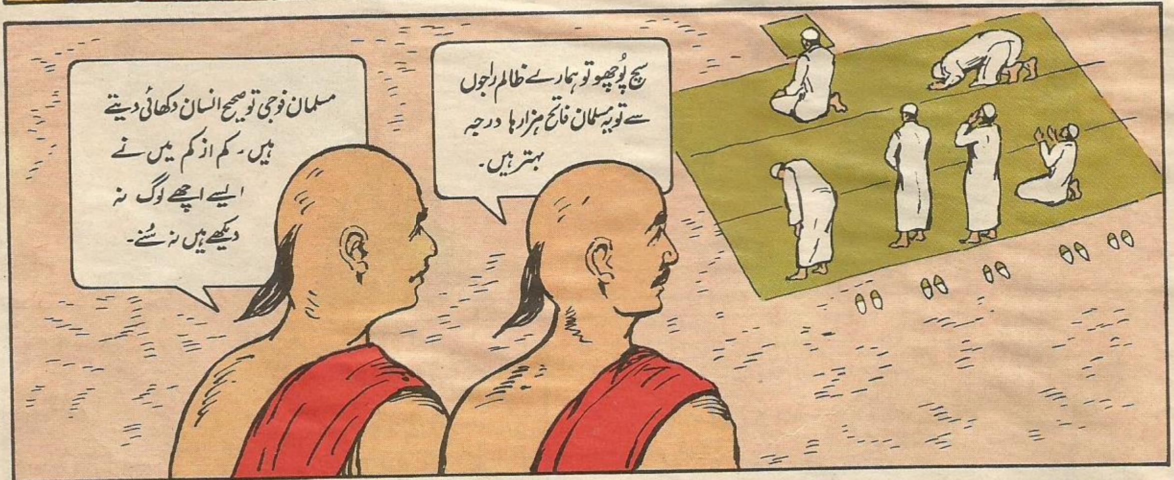
پشاور سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک مقام تخت بھائی ہے۔ یہ دراصل
قدیم بُدھ خانقاہ کے کھنڈرات ہیں۔ یہ خانقاہ 5000 فُٹ کی بلند پہاڑی پر
واقع ہے۔ یہاں پُہنچنے کے لیے زیادہ تر راستہ پیدل عبُور کرنا پڑتا ہے۔

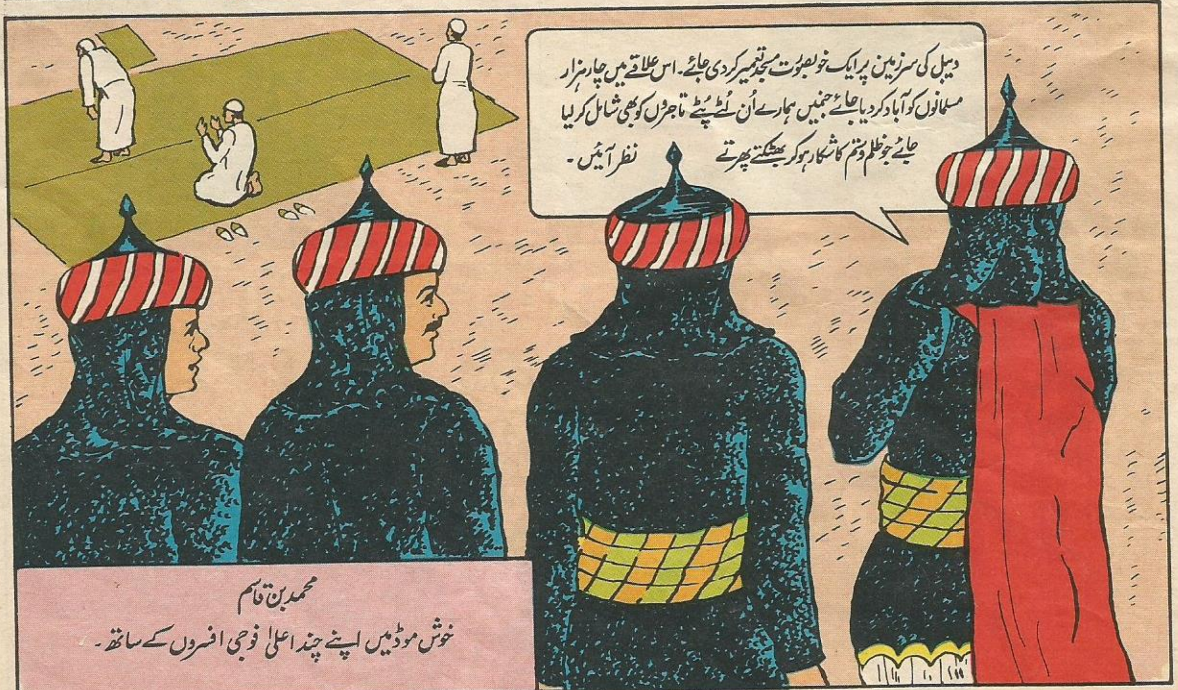
قیامِ پاکستان کے بعد اِس شہر نے ہر میدان میں بے پناہ ترقّی کی ہے۔
یہاں گھریلو دست کاریوں کے علاوہ سگرٹ، گتّے، فرنیچر، دواسازی، سُوتی، ریشمی
اور اُونی کپڑے کے بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ تعلیمی میدان میں بھی یہ شہر کسی
سے پیچھے نہیں۔ شہر کی بیسوں علمی و فنی درس گاہیں علم و فن کی آب یاری کر رہی ہیں۔

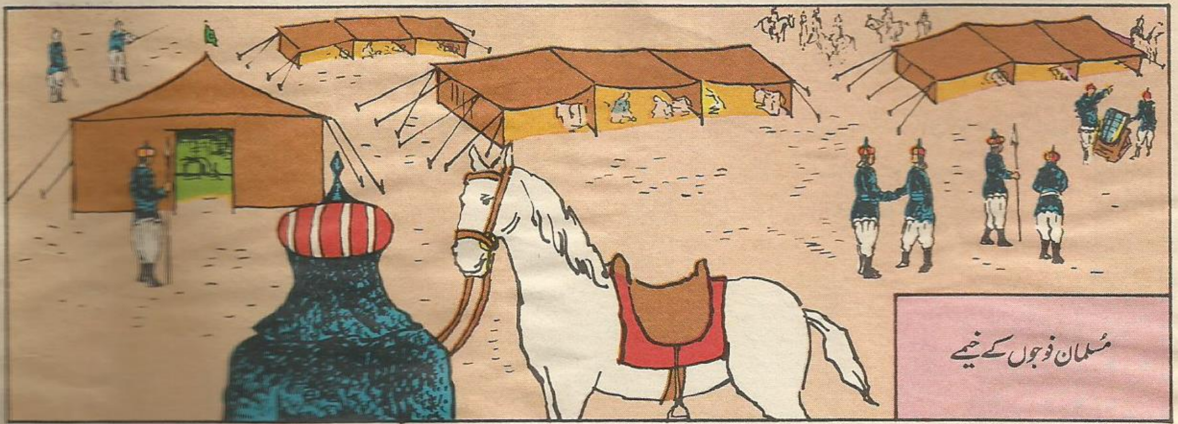


دیبل کے شہریوں سے محمد بن قاسم کا خطاب


بھئی ہمیں تو ڈر تھا کہ مسلمان فتح کے بعد مار دھاڑ لوٹ مار اور ان بداخلاق حرکتوں پر اتر آئیں گے ، جو فاتح لشکر عموماً کیا کرتے ہیں
مگر ان فاتح مسلمانوں نے تو حد کردی ہم سب کو معاف کر دیا ۔ ہمارے تمام قیدی رہا کر دیے اور جنگ کے بعد ہمیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں دی ۔

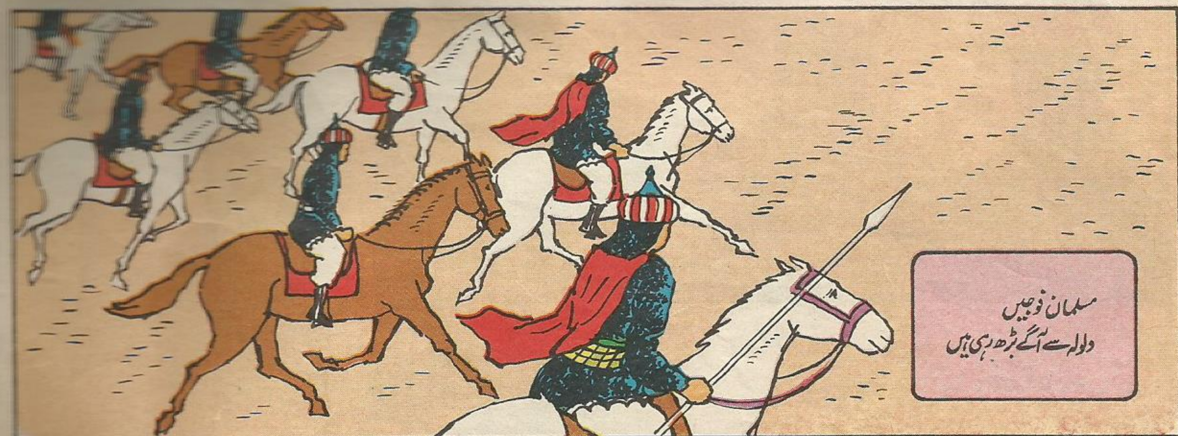

سچ پُوچھو تو ہمارے ظالم راجوں سے تو یہ مسلمان فاتح ہزارہا درجہ بہتر ہیں ۔
مسلمان فوجی تو صحیح انسان دکھائی دیتے ہیں ۔ کم از کم میں نے ایسے اچھے لوگ نہ دیکھے ہیں نہ سُنے ۔

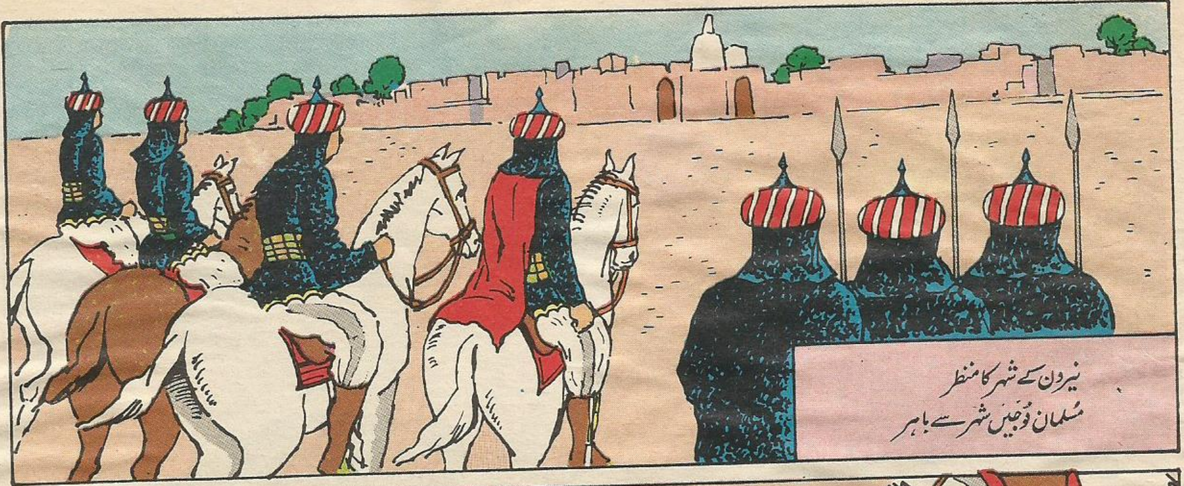

دیبل کی سرزمین پر ایک خوبصورت مسجد تعمیر کردی جائے ۔ اس علاقے میں چار ہزار مسلمانوں کو آباد کر دیا جائے جنمیں ہمارے اُن لُٹے پُٹے تاجروں کو بھی شامل کر لیا جائے جو ظلم وستم کا شکار ہو کر بھٹکتے پھرتے نظر آئیں ۔
محمد بن قاسم
خوش موڈ میں اپنے چند اعلیٰ فوجی افسروں کے ساتھ ۔


مسلمان فوجوں کے خیمے


"یہ خط کہاں سے آیا ہے؟"


اُسے لکھ بھیجو کہ میں
تمہارے اُن تمام سُومار اجوں سے
میدان جنگ میں ملنا چاہتا ہوں۔ تمام
فوجوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ نیرون کی
جانب کوچ کریں


مسلمان فوجیں
ولولہ سے آگے بڑھ رہی ہیں



حضور! نیرون کی فوج اور عوام نے کسی
مزاحمت کے بغیر ہتھیار ڈال دیے ہیں

سجدہ شکر ادا کرو!
جب تک ہم ظالم داہر کو قابو نہیں کر لیتے
ہمارا مشن جاری رہے گا۔

فوجیں اب
لہراج کی جانب
بڑھیں

کالا ریچھ

یہ ریچھ ہمالیہ کے جنگلات میں پایا جاتا ہے۔ اس کی ایک قسم بلوچستان کے پہاڑوں میں بھی ملتی ہے، جسے مم کہتے ہیں۔ عام طور پر 6 ہزار سے 10 ہزار فٹ کی بلندی تک پایا جاتا ہے۔ مگر موسم گرما میں 12000 فٹ تک بھی چلا جاتا ہے۔

مکئی کے کھیتوں میں مکئی کھاتا ہے۔ شہد کا بھی شوقین ہے۔ اچھا تیراک ہے۔ ندیوں سے مچھلیاں بھی پکڑتا ہے۔ پتھر الٹ کر نیچے چھپے ہوئے کیڑے سانس کے ساتھ کھینچ کے ہڑپ کر جاتا ہے۔ دن میں بھی نکلتا ہے اور رات میں بھی۔ مگر جن علاقوں میں انسانی بستیاں زیادہ ہیں، وہاں رات میں نکلتا ہے۔ درختوں پر چڑھ سکتا ہے۔ مگر زیادہ عمر کے ریچھ عام طور پر درختوں پر نہیں چڑھ سکتے۔

موسم سرما میں کسی غار میں چھپ کر، غنودگی کے عالم میں، سردی کے دن گزارتا ہے۔ مادہ عام طور پر دو بچے دیتی ہے۔ بچے دینے کے بعد نر کو بچوں کے نزدیک نہیں آنے دیتی، کیونکہ نر بعض اوقات بچوں کو کھا جاتا ہے۔



WWF

جنگلی حیات قومی ورثہ ہے